قومی زبان

پیارو علامہ اقبال

فاش گویم بتو حرفے کہ ندانند ہمہ کس

اگر ہر پاکِستانی صرف 10 روپے روز

قومی انحصاری فنڈ

میں جمع کرائے تو صرف ایک سال میں

10 بلین ڈالر جمع ہو سکتے ہیں۔

اگر قطرہ قطرہ سمندر بن سکتا ہے تو اسی طرح آپ کے صرف 10 روپے اربوں ڈالر بن سکتے ہیں۔

آپ اپنے عطیات فارن کرنسی یا پاکستانی روپے نیشنل بینک کی اندرون مُلک 1438 اور بیرونِ مُلک 24 برانچوں میں جمع کرا سکتے ہیں۔

آپ کی خدمت کے لئے نیشنل بینک کی منتخب برانچوں پر ایوننگ بینکنگ کی سہولت بھی موجود ہے۔

آزمائش کی اس گھڑی میں کفایت شعاری اپنائیے، فضول خرچی سے بچئے۔

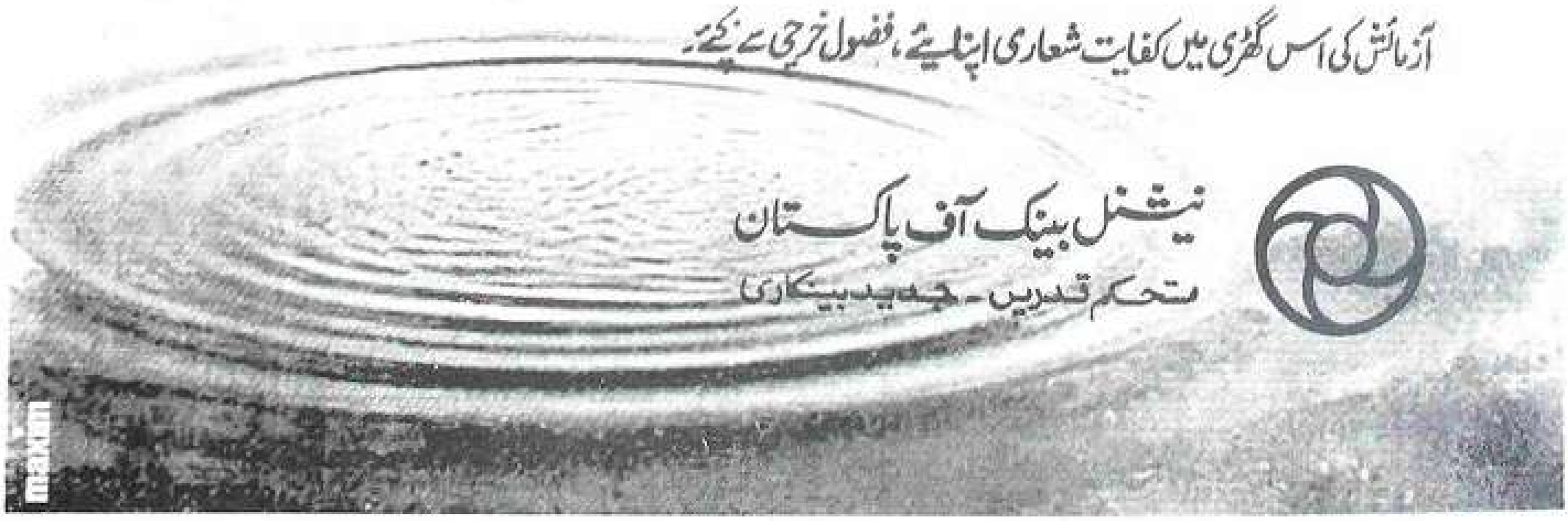

نیشنل بینک آف پاکستان

مستحکم قدریں۔ جدید بینکاری

ماهنامہ

قومی زبان

کراچی

بیاد علامہ اقبال

بانی: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان نومبر ۱۹۹۸ء جلد: ۷۰ شمارہ ۱۱

مضمون نما

اقبال اور خاصان خدا	افتخار احمد عدنی	۹
اقبال اور خطبۂ علی گڑھ ۱۹۱۱ء	ڈاکٹر صدیق جاوید	۱۳
اقبال کی فارسی گوئی پر اعتراضات کا جائزہ	پروفیسر ایوب صابر	۳۱
اقبال کا ذوقِ محاربت	یوسف شاہدہ	۳۸
اقبال بحیثیت متکلم	زاہدہ پروین	۵۲
اقبال، اُن کی شاعری اور عہدِ جدید	سید عظمیٰ گیلانی	۶۲
سر محمد اقبال	ڈاکٹر نثار احمد فیضی	۷۱
شہید حکیم محمد سعید	پروفیسر سحر انصاری	۸۱
حکیم صاحب	مسعود احمد برکاتی	۸۳
جیلانی بانو کا تخلیقی سرمایہ - ایک مختصر تعارف	پروفیسر سحر انصاری	۸۷
گلہائے رنگ رنگ		
نظمیں	ترجمہ: عبدالعزیز خالد	۸۹
رفتارِ ادب	......	۹۱
گردوپیش	......	۹۷

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ــــــ ۱۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۱۱۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۲۲۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ڈی - ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۶۱۴۰۶ - ۴۹۷۳۲۹۶

ہمدرد کی جوشینا

تیار جوشاندہ

نئے میٹلائزڈ ساشے میں نباتاتی اجزاء اور روغنیات کے شفا بخش قدرتی خواص مکمل طور پر محفوظ

زیادہ پُرتاثیر، زیادہ پُرافادیت

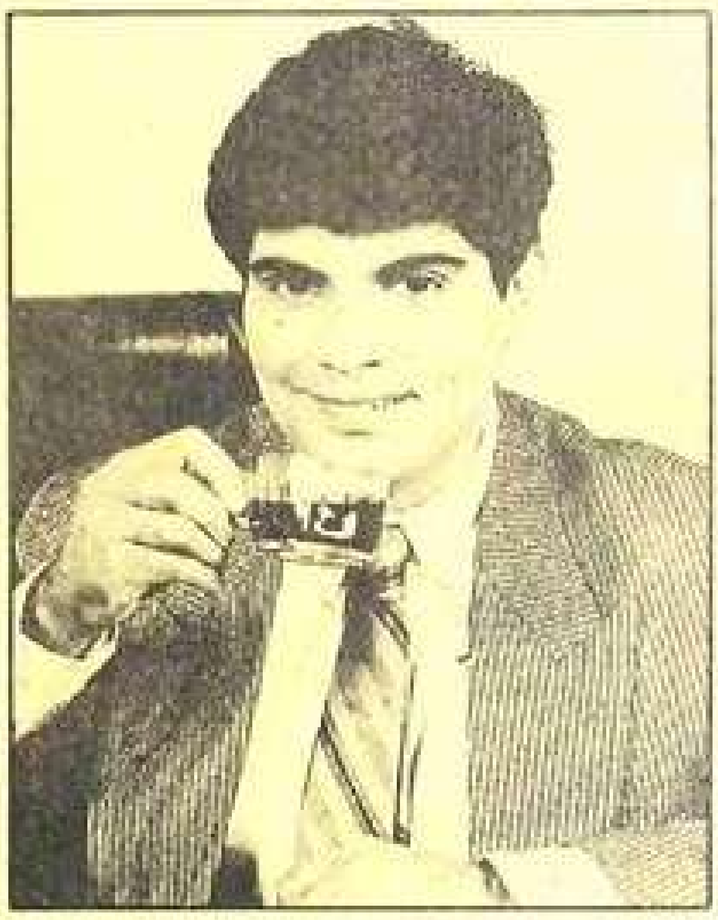

نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش کے علاج کے لیے قدرت کے شفاخانے میں جوشاندے کے نباتاتی اجزاء کی افادیت صدیوں سے مسلّمہ ہے۔

تحقیق و تجربات کی روشنی میں جدید طریقے سے حاصل کردہ جوشاندے کا خلاصہ "جوشینا" نہ صرف نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور ان کے باعث ہونے والے بخار کا تدارک کرتی ہے بلکہ ان تکالیف کے خلاف قوتِ مدافعت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

گھر ہو یا دفتر نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش سے نجات کے لیے ہمدرد کی جوشینا کا ایک ساشے گرم پانی کے ایک کپ میں حل کیجیے۔

جوشاندے کی ایک مؤثر خوراک تیار ہے۔ نہ جوشاندہ اُبالنے کی زحمت، نہ چھاننے کا تردّد۔

نزلہ زکام — جوشینا سے آرام

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

Adarts-HMD/J-1/96

علامہ اقبال نے نہ صرف خالق و مخلوق کے رشتے کی حقیقی پہچان کرائی ہے بلکہ نعوذ باللہ بندے کو اس کے پروردگار کے مقابل لاکھڑا کیا ہے۔ اقبال سے پہلے خودی کی توضیح و تشریح اس عنوان سے نہیں ہوئی تھی جس عنوان سے علامہ نے اپنی نثری اور نظمیہ تحریروں کے ذریعے کی۔ اقبال سے پہلے کے شعرا میں خودی کا تصور کسی قدر مبہم تھا، اس صورت میں خدا سے مکالمے کا لب و لہجہ شعروادب میں فروغ نہ پاسکتا تھا۔ یہ اقبال ہی تھے جنھوں نے خودی کے باب میں اس تیور کا شعر کہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال کے اس شعر اور اس جیسے دوسرے بہت سے اشعار نے ان کے بعد کے آنے والے اصحابِ فکر میں کتنا بڑا فکری انقلاب برپا کیا ہے اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ اس سمت میں علامہ اقبال کی خدمات یہ ہیں کہ انھوں نے نثر و نظم میں خودی کی بہ ہر عنوان تشریح جاری رکھی، خدا اور بندے کے درمیان مکالمے کا سلسلہ قائم کیا، اپنے فلسفیانہ موقف سے اس محکم رشتے کی تفہیم کا رستہ ہموار کیا، اور مال کا یہ موقفِ خودی اُردو شعروادب میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔

اقبال سے پہلے یعنی سودا سے غالب تک ادراکِ خودی شعرا کے ہاں کچھ ایسے دبے دبے انداز میں پہنچا تھا:

ہائے پہنچا نہ گیا قیدِ خرد سے اُس تک

اپنے ہی دام سے چھٹنا مجھے دشوار ہوا

(سودا)

اور غالب نے کہا:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

اقبال کے بعد کی نسل کے اکثر شعرا نے اُسی نہج سے سوچنا شروع کیا جس کی بنا علامہ نے رکھی تھی۔ انھوں نے بھی اپنے پیرائے میں انسان کی عظمت کے گیت گائے اور اسی منہاج کو جولاں گاہ قلم بنایا۔ مثالیں تو بے شمار ہیں۔ لیکن اس وقت صرف ایک مثال جناب احمد ندیم قاسمی کی نظم "انسان عظیم ہے خدایا" پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ راست خطاب کی حد تک قابل گفتگو ہے مگر شاید اپنے وقت کے تناظر میں یہ ناگزیر تھا۔

اقبال کا تفصیلی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انھوں نے اپنے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو بہت سے خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ تصورِ خدا، تصوراتِ کونیات، مسئلہ وحدت، مسئلہ خودی، مسئلہ جبر و قدر، حیات بعد الموت، مسئلہ زمان و مکاں، وغیرہ!

مسئلہ زماں و مکاں کے حوالے سے اقبال کے نزدیک "Super man" کی تقدیر، زمانے کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ اُس "مردِ دلیر" (مردِ مومن) کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ جو زمانے پر اپنا پورا تصرف و اختیار رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی کرنے کے لیے علامہ نے انسان کو اپنی شناخت کے قابل بنایا، اُسے اپنا اعتبار بخشا، اقبال کا اللہ کی اشرف مخلوق پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اسے تادیر بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہی وہ منہاج ہے جس پر چل کر انسان تسخیر کائنات کے مراحل سر کرتا جاتا ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقیناً یہاں مردِ مومن کے الفاظ بہت ہی واضح اور بہت وسیع المعنیٰ ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیے گئے ہیں۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنّف	قیمت	صفحات
(۱) نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	۲۰۰/-	۴۰۰
(۲) غالب کا سائنسی شعور	ڈاکٹر سید حامد علی شاہ	۷۵/-	۱۵۲
(۳) انتخاب کلامِ ناسخ	رشید حسن خاں	۱۲۰/-	۳۳۰
(۴) ہماری زبان، مباحث و مسائل	پروفیسر طاہر فاروقی	۷۵/-	۱۶۰
(۵) اقبال اور ان کا پیغام	پروفیسر رالف رسل	۱۰/-	۲۴
(۶) غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-	۳۸۳
(۷) رباعیاتِ عجائبات	امّو جان ولی دہلوی	۵۰/-	۸۰
(۸) اقوال و امثال	سید یوسف بخاری	۴۵۰/-	۱۰۰۸
(۹) جدید اُردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	۱۷۵/-	۴۶۴
(۱۰) زبانِ واحد	میرین مولٹینو اصفیہ صدیقی	۱۰۰/-	۱۸۴
(۱۱) مشاہیر یونان و روما (حصہ پنجم)	پلوٹارک اسید ہاشمی فرید آبادی	۱۱۰/-	۲۷۰
(۱۲) اردو تنقید کا ارتقا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۵۰/-	۴۴۸
(۱۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر	شفیع عقیل	۹۰/-	۳۱۲
(۱۴) عالمی ادب سے خوبصورت نظموں کے ترجمے	ضمیر احمد	۱۵۰/-	۲۳۰
(۱۵) اُردو پاکستان کی قومی زبان	میاں بشیر احمد	۵۰/-	۹۶
(۱۶) سطالعۂ عبدالحق	سید قدرت نقوی	۱۰۰/-	۱۷۶
(۱۷) آزادی کے بعد اُردو ناول	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۱۵۰/-	۲۸۸
(۱۸) سعید کی پُراسرار زندگی	انتظار حسین	۱۲۰/-	۲۲۹
(۱۹) اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۵۰/-	۵۴۴

پاک و ہند کی مشہور اُردو افسانہ و ناول نگار محترمہ جیلانی بانو انجمن ترقی اُردو پاکستان کی ایک استقبالیہ تقریب میں جو اُن کے اعزاز میں منعقد کی گئی

انجمن کی استقبالیہ تقریب میں صدر انجمن آفتاب احمد خاں اور مہمان خصوصی جیلانی بانو

پروفیسر سحر انصاری، جیلانی بانو کے فن و شخصیت پر مضمون پڑھ رہے ہیں

امراؤ طارق، حاضرین سے محترمہ جیلانی بانو کا تعارف کرا رہے ہیں

محترمہ جیلانی بانو اور استقبالیے کے شرکا حضرات

استقبالیے کا ایک منظر: دائیں سے بائیں آفتاب احمد خاں، جیلانی بانو، تھی حسین خسرو، ڈاکٹر حنیف فوق، جمیل زبیری، رعنا اقبال، انیق احمد، امراؤ طارق

جیلانی بانو کی آمد پر انجمن میں دیے گئے استقبالیہ کے شرکا

اقبال اور خاصانِ خدا

افتخار احمد عدنی

تقریباً پینتیس سال پہلے میں نے حضرت صوفی برکت علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔ دوسری حاضری کے موقعے پر حضرت نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور قریب ہی ایک بزرگ کے پاس ۔لے جا کے چھوڑ دیا، ان پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری تھی، وارفتگی کے عالم میں ان کے منہ سے یہ آواز بار بار نکل رہی تھی۔ "اُم م م مے، اُم م م مے" اس آواز کی دیر تک تکرار کرنے کے بعد وہ کچھ الفاظ ادا کرتے تھے، اور پھر یہی تکرار شروع کر دیتے تھے۔ پھر کچھ بولتے اور پھر یہی تکرار۔ "مے مے مے اُم م م مے" گفتگو میں یا تو خود کلامی ہوتی اور یا خدا سے تخاطب ہوتا اور وہ بھی شکایت کے لہجے میں۔ آدھے گھنٹے اُن کے پاس بیٹھ کے میں حضرت بابا صاحب کے پاس آیا تو اُنھوں نے ان کے احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا "جب سے ہمارے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی بادشاہی کا دور شروع ہوا ہے بہت کم بزرگوں پر وحدت الوجود کی یہ کیفیت گزری ہے" اور پھر تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا، "ایک دن اُن پہ ایسی بیقراری طاری ہوئی کہ وہ فرش پر تڑپنے لگے۔ لوٹتے ہوئے ایک طرف سے دوسری طرف چلے جاتے تھے اور پھر اسی طرح لوٹتے ہوئے واپس ہو جاتے تھے۔ مجھ سے ان کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی۔ میں نے یہ سوچا کہ جب میرے لیے ان کی اس بیتابی اور تڑپ کو دیکھنا اتنا مشکل ہے تو وہ خود اس وقت کس اذیت سے گزر رہے ہوں گے۔" بابا صاحب نے فرمایا کہ "میرے دل میں یہ خیال آنا تھا کہ وہ تڑپتے تڑپتے رک گئے اور کہنے لگے "مجھے تو اس میں کوئی تکلیف نہیں ہے" ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ تڑپنا ان کے لیے عین راحت ہو۔" کچھ دیر بعد بابا صاحب نے فرمایا "لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ تکلیف ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی اور اُنھوں نے اس کی شدت سے بچنے کے لیے اضطراری طور پر جان دے دینے کا فیصلہ کر لیا اور ایک گہرے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ کنویں میں ڈوبنے کے بجائے اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ان کے قدم لکڑی کے ایک مضبوط تختے پر جم گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے پوچھا کہ "کیا تو سمجھتا تھا کہ تو میرے حکم کے بغیر مرنے پہ قادر ہے" یہ تھا جناب عبدالصمد خاں صاحب جیسے مغلوب الحال مجذوب کا تعارف ایک ایسے بزرگ کی زبانی جو اپنی نظیر نہیں رکھتے، جو فقر، ترک اور فنا کی اس منزل پر ہیں جو انسانیت کی معراج ہے۔

حضرت بابا صاحب کی زبانی جناب عبدالصمد خاں صاحب کے مقام سے آگاہی کے بعد میں جب بھی دارلاحسان میں حاضری دیتا ان کی خدمت میں ضرور وقت گزارتا۔ اہلِ حال جن شدائد سے دوچار ہوتے ہیں ان کا کچھ اندازہ خان صاحب کی صحبت میں ہوتا تھا، انھیں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہ شکوہ کرتے ہوئے پایا کہ اس نے انھیں اپنی صمدیت اور بے نیازی کے جلوے کے لیے کیوں مختص کیا، انھیں عبدالرحیم کیوں نہ بنایا، عبدالرحمن کیوں نہ ٹھہرایا، عبدالکریم کہہ کے کیوں نہ پکارا، اپنی صفات لطف و عطا سے محروم رکھ کر اپنی بے نیازی کے صدمے کیوں دیے۔ اس محرومی میں زیادہ تر وہ شکوہ و شکایت ہی کرتے رہتے تھے۔ بعض وقت تو ان کے لہجے میں

اتنی تندی اور تلخی آجاتی تھی کہ حیرت ہوتی تھی کہ کوئی بندہ اپنے معبود سے اس طرح کا کلام کرنے کی جسارت کیسے کرسکتا ہے، کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے ان کی گفتگو اقبال کے اشعار میں بیان کردہ شکایات کی ایک مربوط اور تلخ داستان ہے، کسی شاعر کے کلام میں احتجاج، چبھتے ہوئے تبصروں یا ٹیڑھے سوالوں کو شاعری کی روایت سمجھتے ہوئے لوگ قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے۔ میں نے یہ دیکھا کہ اور بہت سے تلخ موضوعات کے علاوہ خان صاحب نے اقبال کے ان اشعار میں بیان کردہ باتوں پر بڑی لمبی اور بیباک تقریریں کیں:

کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا

وہ لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتادیں میں کہاں ہوں

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

خاموش نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

بعض تقریریں تو خان صاحب کی میں نے ایسی سُنیں کہ ان کے مقابلے میں اقبال کا سارا فلسفۂ خودی اور منصور کا دعوۃ انا الحق بالکل بے حیثیت نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان پر ایسی جلالی کیفیت طاری ہوتی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا احتساب کرنے سے بھی در گزر نہیں کریں گے اور اس کی تمام ناانصافیوں کا حساب بے باق کیے بغیر باز نہیں آئیں گے۔ کبھی یہ دیکھا کہ شیطان ان کا بہت محبوب کردار ہے، وہ کہتے ہیں کہ شیطان کے عرفان کے بغیر نہ خیر و شر کی حقیقت کھلتی ہے، نہ نفس کا عرفان ممکن ہے، نہ ذاتِ باری کا۔ جس نے شیطان کو نہ سمجھا، اس نے کچھ بھی نہ سمجھا۔ خان صاحب سے اس قسم کی باتیں سننے کے بعد میرا کئی بار دل چاہا کہ اپنے کسی ایسے دوست کو ان کے پاس لے جاؤں جو اقبال کے کلام کے رموز کا واقف اور ان کی فکر کے پیچ و خم کا شناسا ہوتا کہ وہ یہ دیکھے مدت العمر کے مطالعے، مشاہدے اور تفکر سے اقبال نے جو حاصل کیا تھا وہ یہاں جذبات کی رو میں خود بخود اُمڈتا چلا آتا ہے، اس سلسلے میں، میں نے سوچا تھا کہ ڈاکٹر اجمل کو زحمت دوں گا کیونکہ وہ حضرت بابا برکت علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے اور دارالاحسان کے فیوض و برکات سے واقف تھے۔ لیکن ان کی غیر متوقع موت سے ایسا نہ ہوسکا۔

ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر اجمل کے انتقال کے چند مہینے بعد جب میں دارالاحسان گیا تو خود عبدالصمد خاں صاحب نے روحانیت کی دنیا میں اقبال کے مقام سے مجھے آگاہی بخشی۔ اُنھوں نے "اُم م م مے، اُم م مے" کی شدید تکرار کے بعد بتایا کہ ایک روز وہ کسی بہت بڑے بزرگ کے مزار پر حاضر تھے تو انھیں حکم ہوا کہ جاؤ اقبال کی زیارت کرو، اُنھوں نے جواب دیا وہ ایک شاعر تھا، میرا شاعری سے کیا تعلق جو میں وہاں جاؤں۔ چنانچہ وہ اقبال کے مزار پہ نہیں گئے۔ جب کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پھر اقبال کی زیارت کی تاکید ہوئی خانصاحب نے یہ صراحت نہیں کی کس بزرگ کے مزار پر ان سے یہ کہا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پہ حاضر ہوئے تھے۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ وہ اقبال کے مزار پر حاضر ہوئے۔ وہاں جو کچھ اُنھیں نظر آیا، اُس پر انھیں یقین نہیں آیا، خان صاحب نے بتایا کہ اقبال کے مزار پر وہ انوار و تجلیات کی بارش تھی کہ وہ

حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب انھیں کوئی ایسا محیر العقول منظر دکھایا جاتا ہے تو وہ اُسے نفس کی کرشمہ سازی سمجھتے ہیں اور اس وقت تک اُسے تسلیم نہیں کرتے جب تک جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوجاتی۔ یا حضرت عبدالقادر جیلانی اس کی صحت کا یقین نہیں دلا دیتے۔ خان صاحب نے فرمایا کہ اقبال کے مزار پہ جو کچھ اُنھوں نے دیکھا تھا اس کی دربارِ رسالت سے بھی تصدیق ہو گئی اور حضرت غوث الاعظم کی جانب سے بھی، اس طرح مجھ پر علامہ اقبال کے واردات اور عبدالصمد خاں صاحب پر نازل ہونے والی کیفیات کی یک رنگی کا راز کھلا۔

ایک استعجاب کے عالم میں خان صاحب سے رخصت ہو کر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ساری رات ذکر و فکر میں گزارنے کے بعد ان کی آنکھ لگ گئی تھی، جس کمرے میں وہ آرام فرما رہے تھے اس سے کچھ دور کے فاصلے پر میں اُن کے داماد نجیب سلمہ سے باتیں کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران میں نے انھیں بتایا کہ کس طرح علامہ اقبال نے خان صاحب کو اپنی روحانی تجلیات سے حیرت میں ڈال دیا تھا، اس پر انھیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ اُنھوں نے کہا حضرت بابا صاحب کا تو مدتوں یہ معمول رہا ہے کہ وہ پہلے داتا دربار میں حاضری دیتے تھے اور پھر وہاں سے اقبال کے مزار پہ جاتے تھے اور وہاں کچھ وقت گزار کے میاں میر صاحب کے مزار کی طرف روانہ ہوجاتے تھے اور ان تین ہستیوں کی زیارت کے بعد دارالاحسان واپس تشریف لے آتے تھے۔ علامہ اقبال سے حضرت بابا صاحب کے اس تعلق خاطر کا مجھے پہلی دفعہ علم ہوا۔ حالانکہ بارہا ایسے مواقع آئے کہ بابا صاحب مجھے اس سے آگاہی بخش سکتے تھے۔ جب کبھی بابا صاحب نے مسلمانوں کے تابناک مستقبل کا ذکر کیا، یا وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی کی طرف اشارہ کیا، یا اسلامستان کے بننے کی نوید سنائی میں نے اس ضمن میں اقبال کے اشعار پڑھے۔ بابا صاحب چاہتے تو مجھے بہت کچھ بتا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک محیط بے کراں کی وسعت، ظرف اور گہرائی سے نوازا ہے، کیا مجال ہے کہ کوئی راز بیقرار ہو کے آشکار ہوجائے۔ ایک دفعہ کسی سالک سے کوئی بے احتیاطی ہو گئی تو بابا صاحب نے صرف اتنا کہا "ہمیں دیکھ، ہم ہفت اقلیم لیے بیٹھے ہیں" اس کے برعکس خان صاحب علامہ اقبال کی طرح تمام واردات قلبی کا برملا اظہار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں:

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

بابا صاحب سب کچھ دیکھتے ہیں، اور خاموش رہتے ہیں، سب کچھ جانتے ہیں اور کچھ نہیں بتاتے، صرف ایک دفعہ مجھ سے علامہ کا ذکر کیا، اور وہ بھی اس طرح جیسے خدمت خلق کی خاطر انھیں قدرت نے کسی جانب متوجہ کر دیا ہو۔ ایک روز حضرت نے فرمایا کہ ہم دارالاحسان سے موٹر میں روانہ ہوئے۔ پچاس ساٹھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ٹائر برسٹ ہو گیا۔ خیال آیا کہ ہم تو نیک ارادے سے نکلے تھے۔ یہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ اتنے میں قریب کی آبادی سے ایک ضعیف العمر شخص آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے پوچھا "جوان تو کون ہے اور تجھے کیا پریشانی ہے" یہ بابا صاحب کا خاص طرزِ تخاطب تھا۔ وہ بہت بوڑھے لوگوں کو بھی شفقت آمیز لہجے میں "جوان" ہی کہتے تھے۔ اُس نے کہا، یوں تو مجھے سارا پاکستان جانتا ہے، لیکن میری خبر کوئی نہیں لیتا، میرا نام علی بخش ہے، میں علامہ اقبال کا پرانا خادم ہوں، یہ سننا تھا کہ بابا صاحب نے فرمایا "پانچ سو روپے ماہانہ آج سے تیری پنشن میرے ذمے ہے" اس طرح علی بخش کی زندگی تک بابا صاحب یہ پنشن علامہ کے وفادار ملازم کو دیتے رہے۔ میں نے اُسے صرف خدمت خلق کا واقعہ جانا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کے پیچھے علامہ کے اور بابا صاحب کے تعلقات کا کیا راز نہاں تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ بابا صاحب علامہ کے مزار پر مدتوں جاتے رہے ہیں میری سمجھ میں آگیا کہ اس حادثے میں کیا مصلحت تھی۔ علامہ چاہتے تھے کہ بابا صاحب ہی علی بخش کی دستگیری کا حق ادا کریں۔

اس کے بعد نجیب سلمہ نے ایک بہت دلچسپ بات بتائی۔ اُنھوں نے کہا ایک روز جب داتا دربار سے بابا صاحب اپنے چھ سات ساتھیوں کے ہمراہ اقبال کے مزار پر آئے تو نماز کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ سب نے مزار کے قریب باجماعت نماز ادا کی۔ قاعدہ اولیٰ کے بعد امام نے سلام پھیرا اور جماعت نماز کی تکمیل کے لیے کھڑی ہو گئی، اس طرح امام نے اور جماعت نے الگ الگ نمازیں پڑھیں، نماز کے بعد بابا صاحب نے علامہ اقبال کے مزار کی طرف دیکھ کے کہا۔ "نہ خود زندگی میں ڈھنگ سے نماز پڑھی اور نہ دوسروں کو پڑھنے دی" اس شکایت میں جو قرب اور اپنائیت ہے وہ بے نظیر ہے۔ یہ علامہ کی عجیب و غریب شوخی تھی کہ امام میں اور جماعت میں تفریق ڈال دی اور بابا صاحب کو اس شکایت پر مجبور کر دیا۔ علامہ گویا یہ کہہ رہے تھے کہ "اے مردِ خدا ایک درویش کے پاس آئے ہو، تو کچھ وقت تو اُسے دو، نماز تو پورے آداب کے ساتھ زندگی بھر پڑھتے رہے ہو" اور بابا صاحب نے یہ جواب دیا کہ "تم جیسے تھے ویسے ہی رہے، واصل بحق ہونے کے بعد بھی تمہاری آزادہ روی میں کوئی کمی نہیں آئی"۔

خاصانِ خدا کی اس نوک جھونک میں کیا غضب کی دل آویزی ہے۔ دونوں اپنے اپنے مشرب پہ قائم ہیں اور اس اختلافِ مشرب کے باوجود دونوں خاص الخاص عنایات سے فیض یاب ہیں۔ "فبای الاء ربکما تکذبان"

پس نوشت:

بابا صاحب کے داماد نجیب سلمہ سے یہ دلچسپ بات سننے کے بعد میں اپنے کمرے میں جا کر یہ مضمون لکھنے بیٹھ گیا، رات کو جب بابا صاحب اپنے کمرے میں تنہا تھے تو میں نے انھیں یہ تحریر سنائی۔ بابا صاحب محظوظ ہو کر سنتے رہے، جب مضمون ختم ہو گیا تو اُنھوں نے مسکرا کے ہاتھ بڑھایا اور مجھ سے مضمون لے لیا۔ میں سمجھ گیا کہ بابا صاحب نہیں چاہتے کہ یہ راز و نیاز کی باتیں عام ہوں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ ان کے تبسم سے اس مضمون میں بیان کردہ باتوں کی مکمل تصدیق ہو گئی۔ حضرت کے وصال کے ایک سال بعد جب میں نے صاحبزادی انیس اختر سے جو بابا صاحب کی روحانیت کی نہایت ہی باکمال وارث ہیں اس مضمون کی اشاعت کی اجازت مانگی تو اُنھوں نے خوشی سے اجازت مرحمت فرمائی اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ سب احتیاط حضرت کی زندگی تک تھی۔ وہ اخفا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے روحانی مقام کو ہمیشہ پردے میں رکھا۔ بابا صاحب نے بغیر کچھ کہے مضمون کی اشاعت کو ملتوی کر دیا اور ان کی وارث نے اشاعت کی اجازت دے کر اخفا اور اظہار کی مصلحت سے ہمیں آگاہی بخشی۔ جو لوگ علامہ کی زندگی کی روحانی جہت سے آگاہ نہیں ہیں وہ ان انکشافات سے خوش ہوں گے۔ اور ممکن ہے چند ناخوش بھی ہوں۔

از راہ کرم مضمون کی پشت پر اپنا پورا پتا تحریر کریں

اقبال کا خطبہ علی گڑھ ۱۹۱۱ء

پچاسی سالہ اشاعت کی روداد

ڈاکٹر صدیق جاوید

"پروفیسر محمد جہانگیر عالم نے اقبال کے خطبہ The Muslim community a sociological study کا نئے سرے سے ترجمہ کیا ہے۔ راقم الحروف نے اس خطبہ کی پچاسی سالہ اشاعت کی روداد اپنے طویل مضمون میں قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مضمون "خطبہ علی گڑھ کا فکری مطالعہ" بھی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ انشاءاللہ متذکرہ ترجمہ اور مضامین ایک جلد میں شائع کیے جائیں گے۔ زیر نظر مضمون متذکرہ طویل مضمون کا خلاصہ ہے۔ اس میں کئی نکات پر بحث شامل نہیں ہے"۔

اقبال اپنی منظومات کی شعری عظمت اور اہل مشرق کو شاعری کے ذریعہ بیداری و خودداری کے پیغام کی بدولت "شاعرِ مشرق" کہلائے تو انسان اور کائنات کے مسائل کی تفہیم کے لیے فکری کوششوں پر انہیں "ترجمان حقیقت" کا خطاب دیا گیا منظومات ان کے فکری پہلو کا شعری اظہار اور خطبات میں ان کے فکری پہلو کا علمی بیان ہیں ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر اقبال کا بہت مشہور خطبہ ہے۔ اس خطبہ کے ساتھ کئی مغالطے منسوب اور کئی غلط فہمیاں وابستہ ہو چکی ہیں جن کے نہ صرف ازالہ بلکہ خود خطبہ کی تفہیم کے لیے اس کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ ضروری ہو گیا ہے مگر اس سے پہلے شاید ایک تمہیدی پس منظر مفید مطلب ثابت ہو گا۔

علمی خطبے عام روزمرہ کے تعلیمی، دینی، مذہبی اور سیاسی خطبات سے اپنی شرائط اور حدود کے اعتبار سے مختلف شناخت اور حیثیت رکھتے ہیں ایک منتخب اور محدود سامعین کے اجتماع کے سامنے کسی نامور ذی علم شخصیت کے کسی علمی موضوع یا مسئلہ پر سنجیدہ، مرتب اور منظم اظہارِ خیال کو خطبہ کہا جاتا ہے۔ مشرق و مغرب کی دنیائے علم و ادب میں اس نوع کے ایک خطبہ یا سلسلۂ خطبات کی ایک مستحکم روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے لہٰذا اس روایت کی استواری کے نتیجہ میں مختلف علمی، ادبی، سائنسی اور فنی موضوعات پر اعلیٰ معیار کی مستقل نوعیت کی تصانیف وجود میں آچکی ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں ایسے خطبات پر مبنی تصانیف کی تعداد شاید ہزاروں کے شمار میں آئے۔ ان تصانیف کو فکر و فن کے بعض گوشوں اور حوالوں سے خصوصی مطالع کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ہمارے یہاں خطباتِ سرسید، خطبات ڈپٹی نذیر احمد، خطبات مدراس از مولانا سلیمان ندوی۔ اقبال کے خطبات (Reconstruction of Religious thought In Islam) خطبات بہاولپور از ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات مولوی عبدالحق، مولوی عبدالحق یادگاری خطبات، خطبات اقبال پنجاب یونیورسٹی وغیرہ سامنے کی مثالیں ہیں۔

ان خطبات کے علمی و فنی موضوعات کا تعین کسی ادارے، انجمن یا ٹرسٹ کے مقاصد، مزاج اور علمی دلچسپی کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ عموماً علم و ادب کی اشاعت کی غرض سے یا اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کے علمی تجسس اور ذوق کی تسکین کے لیے ایک علمی ادارہ، انجمن یا ٹرسٹ اپنے زیرِاہتمام کسی ذی وقار علمی شخصیت کو اپنے مقررہ، مجوزہ یا متفقہ موضوع پر اپنے منتخب اجتماع یعنی زیرِبحث موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مدعوئین کے سامنے اظہارِ خیال کی دعوت دیتا ہے۔ بسا اوقات خطیب (لیکچرار) کو اپنے متعلقہ مضمون میں تخصص کے لحاظ سے کسی علمی مضمون کے ایک گوشہ یا زاویے کو موضوع کے لیے انتخاب کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ خطاب کے لیے مقام تاریخ اور وقت کا تعین عموماً منتظم ادارہ کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے مسلم انڈیا میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور عمرانی مسائل کے تجزیہ و توجیہ جن زعما نے تحریری خطبات صادر فرمائے ان میں اقبال کا نام سرِفہرست ہے اس سلسلے میں اقبال کے مشہور خطبات یہ ہیں:

(۱) تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (Reconstruction کا اُردو ترجمہ)

(۲) خطبہ الٰہ آباد۔ (مسلم لیگ سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء کا صدارتی خطبہ)

(۳) صدارتی خطبہ آل انڈیا مسلم کانفرنس، سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۳۲ء بمقام لاہور۔

(۴) حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت صدارتی خطبہ اورینٹل کانفرنس لاہور۔ ۱۹۲۸ء

ان خطبات کے علاوہ اقبال کے دو ابتدائی خطبے یعنی قومی زندگی ۱۹۰۴ء اور The Muslim community, A Sociological Study-1911 (ترجمہ: ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر) بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے صرف "قومی زندگی" اُردو زبان میں صادر ہوا تھا۔ سوائے مسلم کمیونٹی... (ملت بیضا) کے ان خطبات کے پس منظر، محرک، مقام اور تاریخ کے باب میں شاید کبھی کوئی مغالطہ یا غلط فہمی نہیں پیدا ہوئی۔ مختلف مواقع اور تقاریب پر اقبال کی برجستہ اور فی البدیہہ تقریریں خطبات کے دائرے میں نہیں آتیں۔

برسوں اقبال کے مشہور اور مقبول عالم خطبہ "ملت بیضا..." پر اسرار کا ایک دبیز غلاف چڑھا رہا۔ اس خطبہ کا کافی چرچا ہونے کے علی الرغم اور بطورِ حوالہ اس کا استعمال ہونے کے باوجود، اس سے متعلق بعض نکات تحقیقی دُھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ آئندہ صفحات میں تاریخی اور تحقیقی دُھند کو ہٹا کر خطبہ کے مطلع اور منظر کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس ابہام اور مغالطہ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطبوعہ حرف یا لفظ ایسی حرمت کے حصار میں آجاتا ہے کہ اس میں کسی تغیر یا تخفیف کو گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ بے شک بعض صورتوں میں اسے ایسا جرم سمجھا جانا چاہیے جس کی سزا بھی ہو اسی طرح کوئی واقعہ، عقیدہ یا نظریہ جب تسلیم شدہ اور حتمی حیثیت کا حامل تصور ہونے لگتا ہے تو یہ اپنی اس حتمی حیثیت میں بلاخوف تردید دہرایا یا نقل کیا جانے لگتا ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی ممکن نہیں لہٰذا بیشتر بلند پایہ عالم اور محقق بھی اپنے حواس "معطل کر کے اسے قبول کر لیتے ہیں اور فکر و تامل کے مواقع گنوا کر مروج و متداول واقعہ یا نظریہ کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ سوانح اقبال میں ابھی متعدد واقعات ایسے ہیں جو اگرچہ حریمِ ناز میں مستکن ہیں مگر ان کا دامن حریفانہ کھینچنے کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ اقبال جیسی عظیم شخصیات (خصوصاً جو فکری شخصیت بھی ہو) کے افکار اور ملفوظات وغیرہ درست تاریخی تناظر میں بہتر طور پر سمجھے جاسکتے ہیں اسی طرح تاریخی تناظر ان افکار اور خیالات کے حوالے سے واضح ہوتا ہے بہرحال اقبال کا خطبہ علی گڑھ ایک ایسی ہی مثال ہے جسے موسم سرما ۱۹۱۰ء کا مستند واقعہ تسلیم کرلیا گیا ہے اور اس کے بیان میں ساٹھ ستر برس سے اعادہ و تکرار جاری ہے مگر اس دوران میں کسی نے بھی نہ پوچھا کہ حضرت! موسم سرما ۱۹۱۰ء سے مراد جنوری فروری ۱۹۱۰ء ہے یا نومبر دسمبر ۱۹۱۰ء کا کوئی مہینہ تھا۔ ایک آدھ محقق نے نہ جانے کس بنیاد پر مہینے کا تعین کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۱۰ء لکھ دیا۔ اور تو اور پروفیسر غلام السیدین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر

آل احمد سرور اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری وغیرہ تو علی گڑھ کے ان باصفا بزرگوں میں شامل ہیں جنھیں اقبال سے بھی لگاؤ ہے اور اقبالیات بھی عزیز ہے۔ جنھیں اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ علی گڑھ میں گذارنے کا موقع نصیب ہوا۔ انھیں بھی کبھی خیال نہ آیا کسی "حاضر جلسہ" سے ذکر چھیڑیں اس شب کا جب اقبال خطبہ خواں ہوئے تھے نہ انھیں اس ضرورت کا احساس ہوا کے ان اخبارات و رسائل کا، علی گڑھ میگزین گزٹ کا، ایم اے او کالج علی گڑھ کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کے ریکارڈ کا سراغ لگائیں جس سے پتہ چلے کے ۱۹۱۰ء کی کون سی شبھ گھڑی اقبال نے ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کے اجتماع سے پہلی اور شاید آخری بار ان کے روبرو ہو کر خطاب کیا تھا۔ پھر شعبۂ اُردو علی گڑھ کے پروفیسر اصغر عباس نے علی گڑھ میگزین گزٹ میں چھپی ہوئی اس جلسے کی کارروائی ڈھونڈلی جس میں اقبال نے اپنا یہ خطبہ پڑھا تھا:

"اصغر عباس نے ۱۹۸۷ء میں یہ کارروائی اپنے کتابچے "سرسید" علی گڑھ اور اقبال میں شائع کر کے یہ بتادیا کہ اقبال نے بزبان انگریزی اپنا خطبہ ۹ فروری ۱۹۱۱ء کو پڑھا تھا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس کارروائی سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اقبال کے خطبہ کا عنوان کیا تھا۔ بہر حال اصغر عباس کی اطلاع درخور اعتنا نہ سمجھی گئی اور خطبہ کی مبینہ تاریخ ۱۹۱۰ء سراج اورنگ آبادی کی شاخ نہاں غم کی طرح جوہری تھی، سو ۱۹۹۷ء میں بھی ہری رہی۔ شاید ۱۹۹۸ء میں بھی ۱۹۱۰ء پر اصرار کی مثالیں سامنے آجائیں۔

اب ہم اس خطبہ کی مروج تاریخ ۱۹۱۰ء کی روایت کے منبع و مخرج اور اس کے تکرار و تسلسل کا سراغ لگانے کی سعی کرتے ہیں۔ اقبال نے ۹ فروری ۱۹۱۱ء کو طلبائے علی گڑھ کے روبرو انگریزی میں خطبہ پڑھ کر سنایا، اس کی روداد اخبارات میں چھپی یا نہیں، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم ظفر علی خان نے اس خطبہ کا ترجمہ اپنے رسالے پنجاب ریویو مارچ اپریل ۱۹۱۱ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع کیا جو مئی ۱۹۱۱ء میں منصہ شہود پر آیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مئی ۱۹۱۱ء کے ایک جلسہ میں جو برکت علی اسلامیہ ہال موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا۔ اقبال کی موجودگی میں مولانا ظفر علی خان نے "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے اس خطبہ کا ترجمہ پڑھا(۱)۔ یہ چھپا تھا پروفیسر رفیع الدین ہاشمی مرتب کتابیات اقبال کا زیر بحث خطبہ کے حوالے سے ان کتابچوں کا اندراج ملاحظہ کیجیے۔

"ظفر علی خاں، مولانا ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر"

(۱) مرغوب ایجنسی لاہور، س ن ص ۳۲

(۲) اقبال اکیڈمی لاہور، س ن ص ۳۲

(۳) انجمن معین الاسلام لاہور، س ن ص ۳۲

(۴) اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۴۹ء (۲)

(اسٹریچی ہال علی گڑھ میں ۱۹۱۰ء میں دیا جانے والا ایک لیکچر)

راقم الحروف کی نظر سے چاروں کتابچے گذر چکے ہیں لیکن زیر نظر مضمون کی تسوید کے وقت ان میں سے کتابچہ (۱) سامنے نہیں ہے۔ اقبالیات کے نوادر شناس پروفیسر افضل حق قرشی نے ایک گفتگو میں اپنے اندازے کا اظہار کرتے ہوئے مرغوب ایجنسی لاہور کے کتابچہ کو پہلا کتابچہ قرار دیا۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق بقیہ تین کتابچوں میں کتابچہ (۴) کو اولیت حاصل ہے۔ اس کتابچہ کے آخر میں تمت ۱۹۴۹ء لکھا ہے۔ اس کتابچہ کے صفحہ ۲ پر تمہید، پیش لفظ یا دیباچہ کی قبیل کا کوئی لفظ نہیں ہے جبکہ کتابچہ (۲) اور (۳) کے صفحہ ۲ پر تمہید کا عنوان یکساں ہے۔ تینوں کتابچوں کی تمہیدی عبارت ایک ہے۔ البتہ کتابچہ (۴) کی "تمہیدی" عبارت میں بعض لفظی

اختلاف ہے یا نہیں۔ اس کی پہلی سطر میں "حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمت کے الفاظ ہیں جبکہ کتابچہ (۲) اور (۳) کی پہلی سطر میں "حکیم الامت" کی جگہ "حکیم ملت" کا خطاب ہے۔ کتابچہ (۴) کی دوسری سطر میں ۱۹۱۰ء کے آغاز میں کے الفاظ ہیں۔ اسی سطر میں علی گڑھ کا املا "علیگڑھ" ہے۔ اس کے آخری تین فقرے یہ ہیں "... بعد میں ترجمہ مذکورہ بالا نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ لیکن آجکل نایاب ہے اور تقریباً مومن کی گمشدہ پونجی بن چکا ہے"۔ آخر میں "محمد شاہ" نام ہے جو تمہید لکھنے والے کی نمائندگی کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پورے صفحے کی عبارت جلسہ مئی کی کس تاریخ "دن "شام یا رات کے کتنے بجے اور کس کی صدارت میں ہوا، کچھ معلوم نہیں البتہ صدارت کی بابت ایک مبہم سا بیان ملتا ہے۔ رضیہ فرحت بانو نے شاید قیاس اور اٹکل سے لکھ دیا ہے یا شاید انہیں کہیں سے اشارہ ملا ہے۔ بہر حال انھوں نے ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کو اقبال کا صدارتی خطبہ قرار دیا ہے وہ اپنی مرتبہ کتاب "خطبات اقبال" میں "عرض مرتب" کے عنوان کے تحت لکھتی ہیں:

> "ترجمان حقیقت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے کلام کی نشرواشاعت بہت عرصہ سے ہورہی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت کم ایسے مسلمان ہوں گے جو ان کے حیات افروز پیغام سے کم وبیش روشناس نہ ہوں لیکن صاحب ذوق حلقہ میں علامہ مرحوم کے ان خطبات کے لیے ایک خاص تڑپ اور جستجو موجود تھی جو انھوں نے مختلف جلسوں میں بحیثیت صدر دیے"۔ (۳)

یہ کتاب تین خطبات پر مشتمل ہے جن کے عنوانات، ہر ایک کے متن سے پہلے بہ حروف جلی یوں دیے گئے ہیں:

(۱) خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ الہ آباد۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

(۲) خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس اجلاس منعقدہ لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء

(۳) ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

موخرالذکر کے ضمن میں کسی قسم کی کوئی وضاحت یا حاشیہ آرائی نہیں ہے۔ اگر موخرالذکر صدارتی خطبہ ہے تو اقبال کی موجودگی میں ظفر علی خان نے اسے کیوں پڑھا؟ یوں بھی اقبال کا خطبہ انگریزی زبان میں ہے۔ بنا برین اس کا عنوان مختلف ہے معلوم ہوتا ہے، رضیہ فرحت بانو کا خیال بے بنیاد ہے۔

علی گڑھ میں سنائے جانے کے بعد خطبہ کے اصل متن کی اشاعت تو کیا اس کا ذکر ہی پراسرار طور پر غائب ہوگیا۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً پچیس برس بعد مولانا ظفر علی خان کا ترجمہ چار کتابچوں کی شکل میں ترجمے یا کتاب کے نام کا ذکر نہیں ہے۔ کتابچہ (۲) اور (۳) کے صفحہ ۲ کی دوسری سطر میں ۱۹۱۰ء کے آغاز میں کے جملہ میں لفظ آغاز کے ساتھ سرما اور عبارت کے آخر میں ایک فقرہ "اسی لیے دوبارہ شائع کر کے وقف عام کیا جاتا ہے" ایزاد کردیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابچوں کے صفحہ ۲ پر لفظ تمہید بطور عنوان کا باقاعدہ اعلان ہے۔ دونوں کتابچوں پر محمد شاہ کے بجائے محمد عبداللہ قریشی سیکریٹری انجمن معین السلام موچید روزہ لاہور کا تمہید نگار کے طور پر نام ہے۔ کتابچہ (۲) کے ٹائٹل پر اقبال اکیڈمی لاہور اور اندرونی ٹائٹل پر "ناشر! سید محمد شاہ ام اے سیکریٹری اقبال اکیڈمی لاہور چھپا ہے۔ کتابچہ (۳) کے ٹائٹل پر ناشر محمد عبداللہ قریشی سیکریٹری انجمن معین السلام لاہور چھپا ہوا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ محمد عبداللہ قریشی نے متذکرہ تمہیدی عبارت کی تیرہ سطریں مرتب کی ہوں گی۔ وہ محمد شاہ ایم۔اے مہتمم و منتظم اقبال اکیڈمی لاہور کے معاون رہے ہوں گے جب کتابچہ دوسری بار شائع ہونے لگا تو قریشی مرحوم نے تمہید نگار کے مقام پر محمد شاہ کی جگہ اپنا نام لکھوالیا شاید یہی بنیادی اختلاف ہوگا کہ محمد عبداللہ قریشی نے الگ ناشر کے طور پر کتابچہ (۳) شائع کیا۔ یہی تیرہ سطریں محمد عبداللہ قریشی کے مرتبہ کتابچہ "قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک نظر ۱۹۷۰ء کا حصہ بنیں اس خطبہ کا اپنی تحریروں یا دیباچوں میں تذکرہ

کرنے والے اصحاب بھی اس تمہید ہی کے کم و بیش الفاظ دہراتے رہے شاید کسی واقعاتی انفارمیشن کے بیان کے لیے لغت محدود ہوتی ہے۔ محمد شاہ نے کتابچہ (۱۹۴۹ء ایڈیشن) کے تعارف میں لکھا ہے کہ "ظفر علی خاں نے مئی ۱۹۱۱ء میں (خطبہ کا، ترجمہ عام جلسے میں پڑھ کر سُنایا۔ بعد میں یہ ترجمہ مذکورہ بالا نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا لیکن آج کل نایاب ہے" (۴)۔ شاید کتابی شکل میں شائع ہونے والے ترجمہ سے مراد مرغوب ایجنسی لاہور کا شائع کردہ ایڈیشن ہو۔ فی الحال یہ بات تصدیق طلب ہے بہرحال اگر ہم اس بات کو عبوری طور پر تسلیم کرلیں تو صورت یہ ہوئی۔ کتابچہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر شائع کردہ مرغوب ایجنسی لاہور کے بعد اقبال اکیڈیمی لاہور (ابتدائیہ یا تعارف از محمد شاہ) ۱۹۴۹ء (۳) اقبال اکیڈمی لاہور، تمہید از محمد عبداللہ قریشی (س ن) (۴) انجمن معین السلام لاہور تمہید از محمد عبداللہ قریشی (س ن) کے کتابچے بالترتیب شائع ہوئے۔ آخری گویا (۴) کتابچہ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۱- ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیانی عرصہ میں شائع ہوا۔ اس کا حوالہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ جس کا ذکر آگے آرہا ہے محمد شاہ ایم اے اور محمد عبداللہ قریشی کے نام سے الگ الگ چھپنے والی تمہید متذکرہ وضاحت کے مطابق بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ محمد عبداللہ قریشی کے نام سے دو کتابچوں پر چھپنے والی تمہید کی عبارت یہ ہے:

> "زیر نظر رسالہ ایک لیکچر تھا جو حکیم ملت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ نے ۱۹۱۰ء کے آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا تھا۔ مضمون کا اندازہ خود نام سے ہوسکتا ہے۔ علامہ مرحوم ادب و فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے نہایت بالغ نظر عالم اور ماہر تھے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس مضمون میں اسلام پر مجلسی و معاشی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علامہ نے حکمت ایمانی اور مصلحت عمرانی کا مطالعہ ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں خوب دقت نظر سے کیا ہے۔

اصل انگریزی زبان میں تھا۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں نے اس کو اُردو میں ترجمہ کیا اور مئی ۱۹۱۱ء میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں ترجمہ ایک عام جلسے میں پڑھ کر سنایا یہ جلسہ محض اسی لیکچر کو سنانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا علامہ اقبال بھی اس جلسہ میں شریک تھے بعد میں یہ ترجمہ مذکورہ بالا نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا لیکن آج کل نایاب ہے اور تقریباً مومن کی گمشدہ پونجی بن چکا ہے۔ اسی لیے دوبارہ شائع کر کے وقف عام کیا جاتا ہے۔ (۵) اگر ایک طرف اقبال کے خطبہ کے اصل انگریزی متن کی عدم موجودگی اور گم گشتگی کے طویل ایام میں ظفر علی خان کا ترجمہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر قائم مقام خطبہ کا وظیفہ و فریضہ انجام دیتا رہا ہے تو دوسری طرف چالیس پینتالیس برس بعد متذکرہ کتابچے اس ترجمہ کو تازہ اور اقبال اور اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی دسترس میں رکھنے کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اقبالیات میں بعض شواہد اور حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد عبداللہ قریشی کی تمہید کے حامل کتابچے عام استعمال اور رواج میں رہے اور انہی سے خطبہ کی تاریخ "آغاز موسم سرما ۱۹۱۰ء" آج تک نقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ گویا مغالطہ عام کرنے کا تمام تر بوجھ انہی کتابچوں کے تمہید نویسوں پر ہے"

بہر حال متذکرہ تاریخ کی نقل کا تواتر و تسلسل برقرار نہیں رہنا چاہیے تھا کیونکہ اس تاریخ (آغاز سرما ۱۹۱۰ء) کو منسوخ کرنے والے شواہد سامنے آچکے ہیں راقم کا موقف یہ ہے کہ نئے شواہد کی موجودگی میں ۱۹۸۰ء کے بعد ۱۹۱۰ء کی تاریخ کو تک قلم منسوخ کردیا جانا چاہیے تھا کیونکہ اس کے اعادہ کی کوئی علمی و تحقیقی گنجائش نہیں تھی۔

اقبال کے تصنیفی ذہنی اور فکری ارتقا میں اس خطبہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا تاریخی تعین ضروری ہوجاتا ہے۔ اس غرض سے اس خطبہ کا اشاعتی جائزہ لیا جارہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی تصنیفی اور فکری اہمیت کے باوجود خطبہ کا اصل انگریزی متن

تو برطرف، اس کا ترجمہ بھی، کبھی طویل اور کبھی قلیل وقفوں سے بے قاعدہ اور ناگاہ چھپتا رہا شاید اس لیے ہر جگہ آسانی سے دستیاب نہ ہوتا تھا۔ بہر حال کتابچوں کے بعد خطبہ علی گڑھ کی اشاعت کا اگلا مرحلہ، اقبال کے غیر معروف مضامین کے مجموعوں میں اس کی شمولیت اور اقبال پر مضامین اور کتابوں میں بطور حوالہ اس کے ذکر یا اقتباس سے قائم ہوتا ہے۔

اقبال کے غیر مدون مضامین اور منتشر نثر کا پہلا مجموعہ تصدق حسین تاج نے مضامین اقبال کے نام سے ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔(۶)

اس میں اقبال کے لیکچر کا ترجمہ بعنوان "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر شامل ہے۔ مگر مرتب "مضامین اقبال" نے طبع دوم کے دیباچہ مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۸۵ء میں لکھا ہے کہ مضامین اقبال کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔(۷) تصدق حسین تاج خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۰ ہی لکھتے ہیں:

اقبال پر کسی کتاب یا مقالہ میں خطبہ "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں سے مؤلف اپنے موقف کی تائید میں اقتباسات کا پہلا استعمال کی ہمیں روح اقبال میں نظر آیا ہے۔ اس وقت اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔(۸) روح اقبال کے حصہ دوم بعنوان "اقبال کا فلسفہ تمدن" کی آخری ذیلی بحث "نظام معاشری" میں مرد اور عورت کی مساوات کے ضمن میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں سے اقتباس دیا گیا ہے اقتباس کی عبارت کے ساتھ حوالہ (ملت بیضا پر عمرانی نظر صفحہ ۳۸)(۹) متن کے اندر دیا گیا ہے ملت بیضا سے متعلق یہ صفحہ نمبر کس کتاب کا ہے۔ اس کے کوئی کوائف نہیں فراہم کئے گئے بعد کے ایڈیشنوں میں یہ حوالہ فٹ نوٹ میں آگیا ہے۔ مگر ماخذ کتاب یا کتابچہ کے طباعتی و اشاعتی کوائف پھر بھی نہیں دیے گئے۔ زیر نظر کتاب (روح اقبال) کے حصہ دوم ہی کی ذیلی بحث "فرد اور جماعت" میں دو جگہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے دو اقتباس درج کئے گئے ہیں مگر ان کے ساتھ صفحہ وغیرہ نہیں دیا گیا۔ دراصل ان دنوں اُردو میں حوالہ کا سائنسی انداز رائج نہیں ہوا تھا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اقتباسات متذکرہ کتابچوں میں سے نہیں لیے گئے کیونکہ کوئی کتابچہ ۳۲ صفحات سے تجاوز نہیں کرتا۔ محولہ بالا صفحہ ۳۸ والے اقتباس کی عبارت کا، مقالات اقبال اور کتابچہ میں چھپے ہوئے خطبہ کے متون سے مقابلہ پر پتہ چلا کہ یوسف حسین کے ماخذ خطبہ کا متن صفحہ ۳۸ سے پانچ چھ صفحات آگے جا کر صفحہ ۴۳ یا ۴۴ پر اختتام کو پہنچتا ہوگا۔ ابھی یہ توثیق باقی ہے کہ یوسف حسین خاں کا ماخذ "مضامین اقبال" طبع اول ہے یا "پنجاب ریویو" شمارہ مارچ اپریل ۱۹۱۱ء اس کے بعد ایک بار پھر خطبہ کے ترجمہ کا اُردو رضیہ فرحت بانو کے مرتبہ "خطبات اقبال" میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی تاریخ اشاعت ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے اقبال اکیڈمی لاہور نے ۱۹۴۹ء میں خطبہ علی گڑھ کتابچے کی شکل میں شائع کیا تھا۔ اقبالیات میں "سیرت اقبال" تاریخی اہمیت کی حامل کتاب ہے یہ طبع اول کے طور پر جنوری ۱۹۳۹ء میں قومی کتب خانہ لاہور نے شائع کی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں طبع دوم کی اشاعت کا اہتمام ہمالیہ بک ہاوس دہلی نے کیا تھا۔ سیرت اقبال کے پہلے دونوں ایڈیشنوں میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے بارے میں ایک فقرہ تک نہیں البتہ طبع سوم ستمبر ۱۹۴۹ء شائع کردہ قومی کتب خانہ لاہور میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کا آٹھ سطری تعارف متذکرہ کتابچوں کی تمہید پر مبنی ہے۔ اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اس میں خطبے کی تاریخ آغاز سرما ۱۹۱۰ء ہی لکھی گئی ہے۔ ایک معروف کتاب "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" مولفہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی(۱۰) ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی یہ کتاب بھی ۱۹۷۷ء تک تین بار چھپ چکی ہے۔ اس میں "تاریخ دان اقبال" کے زیر عنوان ایک جگہ لکھا ہے:

> "..... ۱۹۱۰ء میں انھوں (اقبال) نے علی گڑھ کالج کے اسٹریچی ہال میں ایک خطبہ بزبان انگریزی اس عنوان پر دیا تھا۔ Islam as a social and political Ideal اس کتاب کے صفحہ ۱۳۴

پرفٹ نوٹ میں مترجمہ ظفر علی خاں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" لکھا ہے۔ اگلے صفحہ پر "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" مطبوعہ انجمن معین السلام لاہور سے پون صفحہ کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ پہلا موقع ہے کہ خطبہ علی گڑھ کا کوئی درست یا غلط انگریزی نام سامنے آیا مگر یہ سراسر غلط ہے اور اقبالیات میں ایک مغالطے اور ایک بڑی گمراہی کا باعث بنا۔(۱۱)

"مضامین اقبال" کے بعد اقبال کی غیر مدون اُردو نثر کا مجموعہ "مقالات اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد معینی بار اول ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" شامل ہے۔ اس کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں جو لیکچر علی گڑھ میں Islam as a social and political Ideal پر دیا تھا۔ اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں جیسے عالم بے بدل اور ادیب بے مثل نے کیا تھا۔(۱۲)

مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی بار دوم ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اس کا دیباچہ بار اول ۱۹۶۳ء کے مطابق ہے۔

شمل نے اپنی کتاب (۱۹۶۳ء) gabriel's wing کی بلوگرافی میں خطبہ علی گڑھ کی تاریخ ۱۹۱۰ء ہی ریکارڈ کی ہے۔

ایس اے واحد نے ۱۹۶۴ء اور دوبارہ ۱۹۷۳ء میں اقبال کے انگریزی مضامین خطبات اور بیانات پر مشتمل کتاب Thought and reflections of Iqbal کے نام سے شائع کی۔ اس کے ضمیمہ (۱) میں "دی مسلم کمیونٹی" کے زیر عنوان اقبال کے خطبہ کے وہ اقتباسات شائع کئے گئے ہیں جو انڈیا کی ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۱۲ء میں درج کئے گئے ہیں۔ یوں پہلی بار خطبہ اقبال کے اصل انگریزی متن کا ایک حصہ سامنے آیا مگر ایس اے واحد کو "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے بعض حصوں اور دی مسلم کمیونٹی کے متذکرہ اقتباسات کے اصلاً ایک ہونے کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوا۔

لطیف احمد شیروانی نے ۱۹۷۷ء میں speeches writing and statemenst of Iqbal شائع کی تو اس میں مردم شماری رپورٹ کے اقتباسات The muslim community کے نام سے شائع کیے گئے مگر ایس اے واحد کا ذکر نہیں کیا۔

عبدالغفار شکیل نے مارچ ۱۹۷۷ء اس میں مردم شماری رپورٹ کے اقتباسات میں انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے "اقبال کے نثری افکار" شائع کی۔ اس کتاب کی فہرست میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" ۳۱ ویں نمبر پر ہے۔ اس کے چار سطری حاشیہ میں علی گڑھ میں لیکچر دینے کی تاریخ (۱۹۱۰ء) اور انگریزی عنوان Islam as a social and political Ideal کی عام غلطیاں دہرائی گئی ہیں۔ سال اقبال ۱۹۷۷ء میں محمود عاصم نے حرف اقبال کے مندرجات اضافوں، حواشی اور نئی ترتیب کے ساتھ اقبال کے ملی افکار کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے۔ فہرست مندرجات کے مطابق سولہویں نمبر پر اقبال کا خطبہ علی گڑھ ہے۔ عنوان "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نیچے وضاحتی سرخی "اسلام کے معاشرتی اور سیاسی نظریے پر ایک فکر انگیز مقالہ" تیسری سرخی نمایاں حروف میں یہ ہے "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب ۱۹۱۰ء"۔

اس تمہید نوٹ میں مرتب نے لکھا ہے اقبال مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں انھوں نے انگریزی میں خطبہ پڑھا جس کا عنوان تھا۔ Islam as a social and political Idea کاتب کی عدم توجہی سے اس عنوان کے اخری لفظ میں حرف "L" ساقط ہو گیا ہے۔ اگر پہلی بار عنوان پڑھنے والا اس لفظ کو IDEA پڑھے اور ضرورت پڑنے پر نقل کرے تو وہ حق بجانب ہوگا۔ یوں بھی بقول مرتب انگریزی عنوان درست نہیں ہے۔ اس فکر انگیز مقالے کی صدائے بازگشت

پورے برِصغیر میں مدتوں گونجتی رہی۔ اس وقت کے جرائدورسائل نے مقالے کے اقتباسات شائع کیے اور اس کی وسیع پیمانے پر نشرواشاعت کی گئی۔ اس مقالے کواس وقت کے ماحول میں بجاطور پر قومی ترقی کا ایک لائحہ عمل قرار دیا گیا۔ بعد میں ظفر علی خان کے ترجمہ اور جلسہ میں سُنائے جانے کا احوال ہے۔ مرتب نے اساتذہ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے دعوت اور خطبہ کے اقتباسات کی جرائدورسائل میں اشاعت کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے اندازے اور تاثر کی بنیاد پر یہ نوٹ لکھا ہے۔

رسالہ فنون لاہور کے اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں ملک احمد نواز کا مضمون "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کا انگریزی متن "اپنے عنوان کی بنا پر ایک تحقیقی انکشافات اور علمی دریافت خیال کیا گیا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ تاثر توفوری طور پر زائل ہوگیا کہ اقبال کے خطبہ کا اصل انگریزی متن دستیاب ہوگیا ہے۔ البتہ اس مضمون کے بعض مباحث اور حوالوں میں تسامحات ضرور ہیں مگر اس کی دو باتیں قابلِ تحسین ہیں نمبر ایک ملک احمد نواز نے ثانوی ماخذ Thoughts and reflections پر انحصار کرنے کے بجائے اصل ماخذ مردم شماری انڈیا ۱۹۱۱ء کی رپورٹ ۱۹۱۲ء کو بنیاد بنایا ہے اور اس رپورٹ کے مدیر کے انٹروڈکشن کا اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں اس نے کہا کہ میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مذہب پر مرے باب کا مذہب اسلام سے متعلق حصہ ملاحظہ کیا۔ ملک احمد نواز نے "ہفت روزہ "لائٹ کے حوالے سے مشہور انٹرویو میں ایک سوال پر اقبال کا نہایت اہم جواب نقل کیا ہے۔ اس میں اقبال نے کہا:

> The lecture was delivered in 1911 or perhaps earlier (اس انٹرویو کے تذکرہ میں تقریباً ہر اقبال اسکالر نے ٹھوکر کھائی ہے۔ تفصیل ہمارے طویل مضمون میں ملاحظہ کیجیے۔ زیرِ نظر مضمون میں کہیں کہیں اشارے قلم بند کیے جائیں گے)۔

ملک احمد نواز کا قابلِ تحسین کام یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق کے ایک بنیادی اصول کو راہنما بنایا ہے۔ انھوں نے ظفر علی خان کے اُردو ترجمہ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" اور رپورٹ مردم شماری میں خطبہ اقبال کے اقتباسات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

اقبالیات میں خطبہ علی گڑھ کے ناپید مسودہ کی دریافت اور بازیافت ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس کا کریڈٹ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیقی کاوش سے منسوب ہے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو اپنے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ "تصانیف اقبال کا توضیحی و تحقیقی مطالعہ" کی تحقیق کے دوران یہ نایاب مسودہ اقبال میوزیم سے ملا جسے انھوں نے بطور ضمیمہ اضافی کاپیوں کے ساتھ منسلک کیا۔ اسے انھوں نے "بعدازاں تعارفی نوٹ کے ساتھ مجلہ تحقیق (جلد ۳ ش ا، اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں شائع کروایا اس بازیافتہ مسودہ کا مکمل متن تیسری بار ان کے تحقیقی مقالہ کی کتابی اشاعت (۹ نومبر ۱۹۸۲) میں، ضمیمہ ۳ (بسلسلہ باب۵) علامہ اقبال کا ایک نایاب مضمون The muslim community a socialogical study مؤلف کے تعارفی نوٹ کے ساتھ چھپا۔ اس مسودہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس پر اقبال کے اپنے ہاتھ سے ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا گیا نوٹ ہے۔ جس کا پہلا فقرہ یہ ہے The lecture was delivered at aligarh in 1911 (13)

اقبال مئی ۱۹۳۵ء میں نمائندہ پریس کو قادیانی ہفت روزہ سن رائز کے ایک الزام کی وضاحت میں بتا چکے تھے کہ میرا خطبہ (جس کا ظفر علی خاں نے ترجمہ کی تھا)۔ ۱۹۱۱ء یا شاید اس سے تھوڑا پہلے دیا گیا تھا۔ (۱۴) ڈاکٹر ہاشمی نومبر ۱۹۸۲ء کو اپنی کتاب کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں:

> "زیرِ نظر کاوش (تحقیقی مقالہ) کا ایک ثمرہ "دریافتیں" بھی ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر مختلف ابواب میں اپنے محل پر دیکھا جاسکتا ہے۔ تاہم چند اجمالی اشارے یہاں بھی نامناسب رہیں گے"۔

(۱) اقبال کے ایک غیر مطبوعہ اور نایاب مضمون The muslim community کا اصل اور مکمل متن جسے اب تک معدوم تصور کیا جاتا تھا۔ علامہ اقبال کے پاس بھی اس کی نقل محفوظ نہ تھی۔ یہ ۱۹۱۰ء کا خطبہ علی گڑھ ہے (۲۵ برس بعد علامہ اقبال نے خطبہ کے تمہیدی شیذرے میں یادداشت کی بنا پر غلطی سے ۱۹۱۱ء لکھ دیا۔ ضمیمہ ۳)(۱۵) مولف تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ کا مندرجہ بالا بیان تحقیقی معصومیت کی ایک انبساط انگیز مثال ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال نے مئی جون ۱۹۵۵ء میں نمائندہ پریس سے انٹرویو میں خطبہ کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی یادداشت پر کلی انحصار نہیں کیا تھا۔ اس میں کسی قدر اشتباہ کی گنجائش رکھی تھی۔ مگر ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اپنے دستی نوٹ میں اقبال نے خطبہ صادر کرنے کی قطعی اور حتمی تاریخ ۱۹۱۱ء درج کی ہے۔ متذکرہ انٹرویو میں تاریخ کے بیان میں ابہام و ایہام کے برعکس بازیافتہ مسودہ پر نوٹ کا افتتاحی فقرہ کتنا واضح، سیدھا، حتمی اور قطعیت کا حامل ہے دیکھیے: The lecture was delivered at aligarh in 1911.

اس مسودہ کی دریافت تک ۱۹۱۰ء کی تاریخ پر احرار ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ۱۹۱۰ء لکھنے والے تمام اقبال شناسوں کی نفسیاتی مجبوری کہی جاسکتی ہے مگر مسودہ پر اقبال کے "دستی نوٹ" کے بدیہی اور سر ناقابلِ تردید ثبوت کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ کی امتحانی کاپیاں پیش کرتے ہوئے اور اس مقالہ کی "کتابی اشاعت" کے وقت مولف پر لازم تھا کہ مقالہ اور کتاب میں جہاں کہیں خطبہ کے ساتھ اس کی تاریخ (۱۹۱۰ء) کا ذکر ہوا تھا اسے مدلل توضیح یافت نوٹ کے ساتھ تبدیل فرماتے۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ کے صفحات ن، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴ پر لیکچر کی تاریخ ۱۹۱۰ء چھپی ہے۔ صفحہ ۳۷۴ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے:

"اقبال نے اسے ۱۹۱۱ء کا لیکچر بتایا ہے مگر ۱۹۱۰ء صحیح ہے۔

عجیب بات ہے ڈاکٹر ہاشمی علامہ اقبال کے اپنے "قلم سے لکھی گئی تاریخ کو غیر مشروط طور پر اور سیدھی سبھاؤ مسترد کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کسی کی بھی یادداشت کی کوتاہی کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر انکار کے لیے باقبالِ تردید ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے ایک جگہ ڈاکٹر ہاشمی اقبال کے حوالے سے استناد کا درج ذیل معیار قائم کرتے ہیں۔ وہ اقبالیات کے تین سال (۱۹۸۷ء-۱۹۸۹ء) کے جائزہ میں لکھتے ہیں:

> "محمد حمزہ فاروقی کی مرتبہ کتاب "حیات اقبال کے چند مخفی گوشے" جو روزنامہ انقلاب (اپریل ۱۹۲۷ء تا اپریل ۱۹۳۸ء) میں شائع شدہ مختلف النوع اقبالیاتی موازنے پر مبنی ہے اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ موازنہ، اقبال کے سامنے شائع ہوا مرتب کے مطابق اس کے داخلی شواہد موجود ہیں۔ کہ ان میں بیشتر خبریں اور مضامین اقبال کی تائید اور ایما سے شائع ہوئے تھے(۱۶)

ادھر راقم الحروف کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۱۰ء کو خطبہ علی گڑھ کی درست تاریخ ثابت کرنے کے لیے سرے سے کوئی ثبت ہی موجود نہیں ہے کیونکہ ۱۹۱۰ء کی تاریخ کی بنیاد سید محمد شاہ ایم اے اور محمد عبداللہ قریشی کے شائع کردہ کتابچوں میں قریشی کی تحری کردہ تمہید پر استوار ہوئی ہے اس میں ہمارا قیاس ہے کہ تاریخ کا اندراج محمد عبداللہ قریشی کی فروگذاشت اور مغالطہ کا نتیجہ تھا۔ موجودہ اس کی بروقت تردید نہ ہوسکی اس لیے اس تاریخ کا عام تعارف اور اس کا رواج ایک خلاء کی پیداوار ہے تاہم اقبال کے خطبہ (بصورت ترجمہ ظفر علی خان) کو زندہ رکھنے میں ان کتابچوں کا ایک اہم اپنا کردار ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ایک مجلہ تحقیق لاہور اور کتاب "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" میں خطبہ کے گم شدہ انگریزی مسودہ کی اشاعت کے بعد اس لکچر کے مطالعہ نو کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے لیے مکمل انگریزی متن، اُردو ترجمہ مع توضیحات و حواشی اور فرہنگ، ایک ہی جلد میں شائع کرنے کی ضرورت کا احساس کیا گیا۔ اس نئے سلسلے کی پہلی کاوش ڈاکٹر مظفر عباس کی مرہونِ منت ہے انھوں نے ایک جلد میں اقبال کے اصل انگریزی متن کے ساتھ مولانا ظفر علی خان کا ترجمہ، مکتبہ عالیہ اُردو بازار لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔ پیش لفظ، تعارف اور اشاعتی کوائف کے ضمن میں کہیں کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

"راقم نے یہ خطبہ (انگریزی متن) اپنے وضاحتی نوٹ کے ساتھ مجلہ تحقیق (جلد ۳ شمارہ ۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں شائع کرایا اب آٹھ برس بعد ڈاکٹر مظفر عباس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مکمل متن پہلی بار سامنے لا رہے ہیں" (۱۷)

ڈاکٹر مظفر عباس کے مرتبہ متون پر ایک معروف اقبال شناس، ڈاکٹر محمد معروف نے انگریزی زبان میں دو صفحے کا پیش لفظ لکھا ہے ان کے مطابق اقبال نے یہ خطبہ ۱۹۱۰ء میں دیا۔ (۱۸) اسی کتاب کے صفحہ ۲۳ پر اقبال کا نوٹ درج ہے جس میں انھوں نے یہ تاریخ ۱۹۱۱ء بتائی ہے۔ مرتب ڈاکٹر مظفر عباس نے بڑھے چار صفحہ کے انگریزی انٹروڈکشن کے دوران کہا ہے کہ ۱۹۱۰ء کے موسم سرما میں اقبال نے یہ خطبہ دیا۔ مرتب نے مسودہ پر اقبال کا نوٹ نقل کرنے کے بعد درج ذیل پانچ سطری نوٹ قلم بند کیا ہے:

"The date on the above note has been mentioned as21.10.1935. After wards Iqbal wrote an article under the title "Qadianis and orthodox Muslims" in which he discussed the issue in details and contradicted the remark mentioned in his lecture earlier. The weekly 'Light' took the notice of this article of Iqbal and alleged him to be inconsistent in views"(19)

مرتب کے اس پانچ سطری نوٹ میں تین باتیں تنقیح طلب ہیں۔

اس نوٹ میں پہلی بات سرے سے درست نہیں کہ اقبال نے دستیاب شدہ خطبہ پر ۱۹۳۵-۱۰-۲۱ کے نوٹ کے بعد اپنا مضمون Qadianis and Orthoolox Muslim لکھا اول تو یہ مضمون نہیں ایک اخباری بیان ہے۔ علامہ کا یہ بیان ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو اسٹیمین میں تنقیدی اداریے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس اداریے کے جواب میں علامہ اقبال نے اسٹیمن کا ایک مکتوب لکھا جو ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کی تاریخ تو سوا چار مہینے بعد واقع ہوتی ہے۔ دوسرے یہ بات درست ہے کہ متذکرہ اخباری بیان میں اقبال نے قادیانی مسئلہ پر بحث کی ہے جو عنوان سے ہی ثابت ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اقبال نے اس بیان میں اپنے گزشتہ (earlier) خطبہ (علی گڑھ) میں مذکورہ ریمارک کی تردید کی ہے۔ اس نوٹ کی تیسری بات درست نہیں کہ ہفت روزہ لائٹ نے اقبال پر inconsistent views کا الزام لگایا تھا اسکی اصل یہ ہے کہ ایک دوسرے قادیانی ہفت روزہ "سن رائیز" کے ایک مکتوب نگار نے اقبال کے خطبہ میں "قیادنی فرقے" کے ذکر کے حوالے سے ان پر inconsistency کا الزام لگایا تھا۔ اس کا جواب اقبال نے نمائندہ پریس کو دیا تھا۔

اسی جواب میں اقبال نے کہا تھا کہ یہ خطبہ ۱۹۱۱ء میں یا شاید ذرا پہلے دیا گیا تھا۔ اقبال نے یہ بھی کہا کہ "اب سے ربع صدی

پیشتر مجھے اس تحریک (قادیانی) سے اچھے نتائج کی اُمید تھی ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا۔ جب ایک نئی نبوت بانیٔ اسلام ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے"۔(۲۰)

مرتب ڈاکٹر عباس نے in consistent in views کی phrase واوین میں دی ہے مگر ماخذ نہیں بتایا کیونکہ شیروانی اور عبدالواحد کے مرتب انگریزی مجموعوں اور حرف اقبال میں inconsistenc کا لفظ ملتا ہے۔

زیر تبصرہ خطبہ علی گڑھ کا اصل انگریزی متن اور نیا اُردو ترجمہ مع حواشی و توضیحات جولائی ۱۹۸۹ء میں یکجا "ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ" کے نام سے چھپا۔ اس کے ٹائٹل کے آغاز میں "علامہ اقبال کے خطبہ علی گڑھ ۱۹۱۰ء کا اُردو ترجمہ مع حواشی و توضیحات" لکھا گیا ہے۔ اسے انڈر لائن بھی کیا گیا ہے۔ اس کے مرتب اور مترجم شاہد اقبال کامران ہیں۔ اس کا پیش گفتار ۸ جولائی ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر رحیم بخش شاہین ایسوسی ایٹ پروفیسر اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے لکھا ہے ان کے مطابق۔

انھوں نے (اقبال) نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں محمڈن ایگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں The muslim Community. A Sociological Study. کے عنوان سے پیش کیا۔(۲۱)

اس کتاب میں ظفر علی خاں کا ترجمہ کیا ہوا خطبہ شامل کرنے کے بجائے اس کا نئے سرے سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ مترجم کا یہ ایک صحیح سمت میں قدم ہے ہم طوالت کے خوف سے یہاں تفصیلی تبصرہ شامل نہیں کر رہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اقبال کے خطبے کے اُردو ترجمہ سے پہلے ان کے ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے نوٹ کا اُردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اقبال نے اس نوٹ کے پہلے فقرے میں خطبہ کی حتمی تاریخ دو ٹوک الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ خطبہ ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ میں دیا گیا تھا"۔

اس پر مولف و مترجم شاہد اقبال کامران نے حاشیہ میں غالباً ڈاکٹر ہاشمی کا تتبع کیا ہے ان کا بھی اقبال کی وضاحت کے بارے میں یہ خیال ہے کہ:

"یہ تسامح ہے، اقبال نے یہ خطبہ ۱۹۱۰ء میں دیا تھا"۔(۲۲)

خطبہ علی گڑھ کے انگریزی اور اس کے اُردو ترجمہ کے متون کی ایک ہی جلد میں اشاعت سامنے آئی ہے۔ مشہور محقق اور مورخ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ناظم بزم اقبال لاہور نے اقبال کے خطبہ علی گڑھ اور اس کے اُردو ترجمہ کی صحت متن کے ساتھ شائع کرنے کے پروگرام پر عمل درآمد کرتے ہوئے اصل متن خطبہ اور ترجمہ (ظفر علی خاں) کو ایک ساتھ رسالہ اقبال لاہور کے شمارہ ۱۹۹۱ء میں تمہید کے ساتھ شائع کر دیا بعد ازاں نومبر ۱۹۹۴ء میں انھیں کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا اس تمہید کا آغاز ان الفاظ میں ہوا ہے:

"ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے ۱۹۱۰ء کے موسم سرما (غالباً دسمبر ۱۹۱۰ء) میں بزبانِ انگریزی دیا تھا۔
جس میں اس زمانے کے احوال و ظروف کے حوالے سے اسلامیانِ ہند کی عمرانی صورت حال کا
جائزہ لیا گیا تھا....."(۲۳)

یاد رہے مجلہ تحقیق جلد ۳، شمارہ ۱ میں اور ڈاکٹر ہاشمی کے مطبوعہ تحقیقی مقالے "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ضمیمہ ۲، (۱۹۸۲ء) میں اقبال کے خطبہ کا انگریزی متن مع ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کا نوٹ نیز ڈاکٹر مظفر علی خاں کا مرتبہ مجموعہ (ملت بیضا.....) اکثر ذوالفقار صاحب کے پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مرتبہ کتابچے میں خطبہ کے انگریزی متن سے پہلے یہ نوٹ نقل کیا

ہے۔(۲۴) اس نوٹ میں اقبال نے خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۱ء بتائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر نمائندہ پریس کومسی جون ۱۹۳۵ء میں اقبال کا انٹرویو بھی ہے جس میں اقبال نے کہا تھا کہ میری یادداشت کے مطابق یہ خطبہ ۱۹۱۱ء یا اس سے (ذرا) پہلے دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ذوالفقار ۱۹۶۷ء میں اپنی تالیف "ظفر علی خاں ادیب و شاعر" اور ۱۹۷۸ء میں اپنی تالیف "اقبال کا ذہنی ارتقا" میں خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۰ء ہی بیان کر چکے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر صاحب بری الذمہ قرار دیے جاسکتے ہیں کہ اس وقت تک کی فراہم انفارمیشن کے مطابق یہی تاریخ درست خیال کی جاتی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے، نئے منظر نامہ کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو خطبہ کی تاریخ متعین کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ البتہ اس کتابچے کی تمہید میں ان کی ایک سہو قابلِ ذکر ہے۔ گذشتہ صفحات میں وضاحت ہو چکی ہے کہ اقبال کے خیالات میں تضاد کا الزام ہفت روزہ لائٹ نے نہیں بلکہ ہفت روزہ "سن رائز" کے ایک مکتوب نگار نے لگایا تھا مگر ڈاکٹر ذوالفقار لکھتے ہیں:

"اس (قادیانی) فرقے کے ایک ہفت روزہ ترجمان Light نے تنقید کرتے ہوئے اقبال کے خیالات میں تضاد کا پہلو نکالا اور ان پر inconsistence کا الزام لگاتا تھا"۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی نویں دہائی خطبہ علی گڑھ کی حقیقی تاریخ کے ضمن میں ثبوت بہم پہنچانے اور حتمی فیصلہ کرنے کی دہائی ہے گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے خطبہ علی گڑھ کا انگریزی متن مع ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کا اقبال کا محررہ نوٹ پہلی بار مجلہ تحقیق لاہور کے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں چھپا۔ دوسری بار نومبر ۱۹۸۲ء میں کتاب "تصانیف اقبال کا تحقیقی" و توضیحی مطالعہ میں بطور ضمیمہ شائع ہوا مگر خطبہ اور اس پر نوٹ کا کوئی خاص impact نہ ہوا۔ خود انگریزی متن کے دریافت کنندہ اور معروف اقبال شناس کو اس کی اہمیت کا اندازہ اور اس کے dimensions کا احساس نہ ہونے پایا۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر دریافت اثر اندازی کے لیے ایک خاص وقت درکار ہوتا ہے۔ یوں کہیے۔ امریکہ تو دریافت ہو جاتا ہے مگر اس کو U.S.A بننے میں ایک زمانہ گذارنا اور ایک تاریخی عمل سے گذرنا پڑتا ہے۔ تائید غیبی صرف داستانوں کے دیو قامت ہیروز کا مقدر نہیں ہے۔ تائید ایزدی ہم ناتواں انسانوں کا بھی نصیب اور ان کے کاموں کا نصاب ہے۔ خطبہ علی گڑھ کے انگریزی اور اُردو متنوں کے مرتبین، اقبال کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر جیسی روشن دلیل کو جھٹلا رہے تھے کہ پردۂ غیب سے نومبر ۱۹۸۷ء میں ایک اور ثبوت طلوع ہوا۔ ہماری مراد اُردو علی گڑھ کے پروفیسر اصغر عباس کی کتاب "سرسید، اقبال اور علی گڑھ" سے ہے اس کے بعض مندرجات کے بین السطور مطالعہ سے ہم نے کئی نتیجے اخذ کیے ہیں جو ہمارے طویل مضمون کا حصہ ہیں مگر اس وقت ہم اس کتاب سے اس جلسہ کی کاروائی بہ اختصار نقل کرتے ہیں جو اقبال کا خطبہ سننے اور سُنانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا "ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا لکچر" کے زیر عنوان لکھا ہے:

"۹ فروری ۱۹۱۱ء کو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاء لاہور نے شب کے نو بجے طلبائے علی گڑھ کالج کے روبرو اسٹریچی ہال میں لیکچر دیا۔ اس نہایت پر مغز و فلسفیانہ لکچر کا زیادہ تفصیلی ماحصل تو ہم کسی آئندہ اشاعت میں درج کر سکیں گے۔ سردست اسی قدر بتانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ آپ نے یہ امر طلبا کے ذہن نشین کیا کہ..... ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کی ایک یہ بھی خصوصیت ہوگی کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو ان کے مذہب اور تاریخ سے آگاہ کرے گی لکچر کے ختم ہونے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سینئیر ٹیوٹر کالج نے منجانب ٹرسٹیان، اسٹاف اور طلبہ قابل لکچرار کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد جلسہ برخاست ہو جانے والا تھا مگر حاضرین کی پیہم درخواستوں اور بے حد اصرار پر ڈاکٹر اقبال صاحب نے اپنے انداز خاص

میں اپنی ایک نہایت عمدہ نظم پڑھی جس کو حاضرین نے نہایت دلچسپی کے ساتھ سُنا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے ڈاکٹر اقبال صاحب کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا" (۲۵)

اس کتاب میں جلسہ کی کاروائی کا ماخذ نہیں دیا گیا۔ اصل تاریخ معلوم ہونے کے باوجود ایک شبہ اور غیر یقینی کی فضا دماغ کو اطمینان نہیں بخشتی۔ راقم الحروف نے پروفیسر اصغر عباس سے اس کارروائی کے ماخذ اور استناد کی بابت استفسار کیا۔ وہ راقم الحروف کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۹ اگست ۹۸ء میں لکھتے ہیں "جواب نمبر ۳ صفحہ ۳۸ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا لکچر ۱۵ فروری ۱۹۱۱ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے لیا گیا ہے"۔ لطیف احمد شیروانی کی Speeches writings and Statements of Iqbal کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن ڈائرکٹر اقبال اکادمی، پاکستان کے مطابق سابق ایڈیشنوں کی اصلاح یافتہ صورت ہے۔ شیروانی کے ۱۹۷۷ء تک کے تینوں ایڈیشنوں میں یہ خامی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی کہ انھوں نے حواشی مرتب نہیں کیے بلکہ اسمبلی پر اقبال کے اولین انگریزی مضمون مطبوعہ رسالہ Indian Antiquary Bombay شمارہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں اقبال کے فراہم کردہ حواشی کو اپنے مجموعہ میں نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ۱۹۹۵ء کے ایڈیشن میں اقبال اکادمی کے زیرِ اہتمام حواشی کا اضافہ ایک مستحسن اقدام ہے اس ایڈیشن میں بعض باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ خصوصاً خطبہ علی گڑھ کے حوالے سے یہ احسان ناشناسی نہ ہوگی (۲۶) اگر خطبہ کے حواشی وغیرہ کے ضمن میں تسامحات کی نشاندہی کردی جائے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ آئندہ یہ ایڈیشن استعمال کرنے والے اصحاب متنبہ ہوجائیں اور غلطی کا عام چلن میں آنے سے پہلے ہی ازالہ ہوجائے۔

خطبہ علی گڑھ کے حوالے سے سب سے پہلی غلطی "پبلشرز نوٹ" میں وارد ہوئی ہے۔ زیر نظر ایڈیشن میں خطبہ علی گڑھ کے مکمل متن کے مشمول کی نوید سناتے ہوئے اس کا عنوان درج ذیل الفاظ میں دیا گیا ہے۔ Muslim community a Sociological Review اب معلوم نہیں study کی جگہ review کا لفظ کیسے در آیا اور پروف ریڈنگ میں بھی برقرار رہا۔ غالباً نوٹ لکھنے والے کے ذہن میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کی سرخی براجمان تھی۔ خطبہ کا اصل متن زیرِ نظر مجموعہ کے صفحہ ۱۱۸ سے صفحہ ۱۳۷ تک درج ذیل عنوان کے تحت شائع ہوا ہے۔ The Muslim community a Sociological Study اس عنوان کے حوالے سے صفحہ ۱۱۸ پر ایک فٹ نوٹ چھپا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں یہ فٹ نوٹ لکھتے ہوئے کہنا کہ خطبہ ۱۹۱۰ء کے موسم سرما میں دیا گیا کسی طور بھی روا اور جائز نہیں ہے۔ البتہ یہ تردید (ہاشمی صاحب اپنے تحقیقی مقالہ میں پہلے ہی کر چکے ہیں) کہ علی گڑھ کے خطبہ کا عنوان Islam as a social and political ideal نہیں تھا جیسا کہ بعض سکالرز لکھتے رہے ہیں، (۲۷) بہت اہم اور ضروری تھی اس فٹ نوٹ میں یہ بھی دیا گیا ہے کہ خطبہ کا متن رفیع الدین ہاشمی کی کتاب تصانیف اقبال شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۷ء صفحہ ۴۴۹ سے لیا گیا ہے درست نہیں ہے۔ کتاب کے نامکمل نام اور غلط سال اشاعت کی بنا پر سارا حوالہ منہدم ہوگیا ہے۔ اس نام کی کوئی کتاب ہاشمی صاحب نے ۱۹۷۷ء میں نہ تالیف کی اور نہ مرتب کی۔ ۱۹۷۷ء میں ہاشمی کی مرتبہ "کتابیات اقبال" شائع ہوئی تھی اور اس وقت تک وہ خود خطبے کے اصل متن سے بے خبر تھے ہاشمی کا مقالہ پی ایچ ڈی "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے نام سے ۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو شائع ہوا۔ اس کتاب میں (صفحہ ۴۴۹ سے ۴۶۸ تک یہ خطبہ دوسری بار (پہلی اشاعت مجلہ تحقیق ۱۹۸۰ء) شائع ہوا شیروانی کی کتاب speeches (۱۹۹۵ء) کے صفحہ ۱۲۸ پر خطبہ میں قادیانی فرقہ کے بارے میں اقبال کے توضیحی ریمارک پر فٹ نوٹ میں ایک طویل وضاحتی نوٹ شائع کیا گیا ہے۔ یہ وضاحتی نوٹ ڈاکٹر مظفر عباس کے مرتبہ خطبہ کے صفحہ ۲۳-۲۴ پر فٹ نوٹ کی، کسی ترمیم کے بغیر نقل ہے۔ اور "اصول نقل" کے مطابق اس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر مظفر عباس کے اس فٹ نوٹ پر زیر نظر مضمون میں اپنے مقام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہی تبصرہ شیروانی کے ایڈیشن ۱۹۹۵ء کے زیر نظر فٹ نوٹ پر بھی وارد ہوتا ہے۔

زیرِ بحث خطبہ کی اس کے بعد کوئی اشاعت ہمارے علم میں نہیں۔ البتہ اقبال پر نئی کتب اور رسائل میں کسی بحث یا بیان کے ضمن میں خطبہ علی گڑھ کا حوالہ یا اس کا کوئی اقتباس آجاتا ہے۔ جب تک اقبالیات میں کام ہورہا ہے کسی نہ کسی حوالے سے یہ خطبہ زیرِ بحث آتا رہے گا۔ بہر حال گزشتہ صفحات سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال شناس اصحاب نے خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۰ء کو ایمان اور یقین کی حد تک قبول کرلیا ہے وہ اس میں حق بجانب نہیں جن حضرات کے مئی جون ۱۹۳۵ء (نمائندہ پریس کو انٹرویو) تک اگر نہیں تو اکتوبر ۱۹۸۰ء (مجلہ تحقیق میں اقبال کے مسودہ پر ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے نوٹ تک) کے بعد ۱۹۱۰ء کو خطبہ کی تاریخ لکھا ہے۔ وہ اصلاح احوال کی ذمہ داری سے سبک روشن نہیں قرار دیے جاسکتے۔ (۲۸)

اقبال نے قطعیت کے ساتھ خطبہ صادر کرنے کی تاریخ ۱۹۱۱ء بتائی ہے۔ لہذا اسے تسلیم کرنے میں کوئی تحقیقی، اخلاقی اور قانونی امر مانع نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے اس سلسلے میں ایک ٹھوس معاصر شہادت میسر آچکی ہے۔ ہمارا اشارہ پروفیسر اصغر عباس کی کتاب "علی گڑھ" "سر سید اور اقبال" کی طرف ہے۔ جس کا زیر نظر مضمون کے ابتدائی صفحات میں حوالہ دیا گیا ہے:

> "اقبال کے خطبہ علی گڑھ ۱۹۱۱ء کے اس اشاعتی جائزے اور اس ضمن میں بحث کے بعد سوانح اقبال اور فکر اقبال کے ارتقا کے مطالعات میں choronolgy میں اس شق کا حتمی تعین ہوجاتا ہے۔ اب جب بھی خطبہ علی گڑھ کی تاریخ لکھی جائے گی تو ۹ فروری ۱۹۱۱ء لکھی جائے گی کیونکہ اس کی نہ صرف ضابطہ تحریر میں آئی ہوئی معاصر شہادت مل گئی ہے بلکہ اس پر خود اقبال کی مہر تصدیق ثبت ہے"۔

ہم نے اپنے زیر طبع طویل مقالے میں خطبہ علی گڑھ کی درست تاریخ کے فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے کے علاوہ محض اس تاریخ کے حوالے سے دوسرے کئی ضمنی پہلو نکالے ہیں اور ان پر طویل مضمون میں بحث کی ہے۔ ان مباحث کی اشاعت الگ الگ مضامین کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اگر ہماری زیر تشکیل کتاب کے چھپنے میں زیادہ تاخیر کا اندیشہ ہوا" تو ہم متذکرہ مباحث کا ایک سلسلہ مضامین کی صورت میں شائع کردیں گے۔ ہم یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے ان میں سے چند مباحث کے موضوعات کی طرف اشارہ کردیتے ہیں۔

(۱) اس مغالطے کا مخرج کیا ہے کہ اقبال کے انگریزی خطبہ کے عنوان Islam as a social and political Ideal تھا جس کا ظفر علی خاں نے ترجمہ کیا۔

(۲) اقبال کو اپنے خطبہ کا مسودہ کہاں سے ملا۔

(۳) علی گڑھ میں اقبال کے خطبے کا پس منظر۔

(۴) اقبال کے خطبہ کی تسوید کا محرک کون ہے۔

(۵) ہفت روزہ لائٹ وغیرہ کے الزامات کے باب میں اقبال کو انٹرویو کرنے والا نمائندہ پریس کون ہے؟ وغیرہ (اس زیرِ نظر مضمون میں بھی ایک فٹ نوٹ ملاحظہ کیجیے) نیز اس انٹرویو کا تناظر اور پس منظر کیا ہے۔

(۶) اقبال نے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۵ء میں تین مواقع کے باوجود انگریزی خطبہ کیوں شائع نہیں کرایا۔

امید ہے اب خطبہ علی گڑھ صادر کرنے کی تاریخ ۹ فروری ۱۹۱۱ء مصدقہ اور طے شدہ ہوجانے کے بعد اس کا چلن عام ہوجائے گا۔ فی الحال چار کتابوں میں خطبہ علی گڑھ کی تاریخ کے لیے ۱۹۱۱ء کا سن عیسوی درج کیا گیا ہے۔

(۱) پروفیسر اصغر عباس نے (جب کہ اس مضمون میں کسی دوسری جگہ بتایا گیا ہے) اقبال کے خطبہ کے لیے منعقد اجلاس کی تاریخ ۹ فروری ۱۹۱۱ء بتائی ہے۔

(۲) راقم الحروف نے اپنے پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ "فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ" کی تسوید اور یونیورسٹی میں evoution کے لیے پیش کردہ ٹائپ شدہ جلدوں میں، اقبال کے خطبہ کی تاریخ بعض حوالوں سے مروج اور متداول تاریخ ۱۹۱۰ء ہی تحریر کی تھی مگر اس تحقیقی مقالہ کی طباعت کے لیے، نئی معلومات کے مطابق اسے مسودہ میں ۱۹۱۱ء سے بدل دیا۔ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۶ء کے درمیان یہ مسودہ تین بار نئے سرے سے کمپوز ہوا۔ اس کی پروف ریڈنگ ہوئی۔ دو بار کمپوزنگ ضائع ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں کتاب "فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ" کی طباعت و اشاعت کے موقع پر راقم سخت علیل تھا۔ لکھنے پڑھنے سے دل برداشتہ اور بیزار ہوا۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کے مراحل سے لاتعلقی کی حد تک دور رہا۔ نتیجہ یہ ہوا خطبہ کی تاریخ تو تبدیل ہو گئی مگر جزوی غلطیوں جیسے مہینہ وغیرہ کی اصلاح نہ ہو سکی۔ کتاب کے اختتامی فقرے یوں نامکمل رہ گئے گویا کتاب نامکمل چھپی ہے۔ اس کتاب کا ایک مختصر ذیلی باب "اقبال کے عمرانی فکر میں عورت کا مقام" مجلہ راوی لاہور شمارہ..... میں شائع ہوا تو اس میں خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۰ء ہی چھپی تھی۔

(۳) ایک اور کتاب جس میں خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۱ء بتائی گئی ہے تلاش منزل کے نام سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی ہے جو اس کے مولف اقبال شفیع کی یادوں اور یادداشتوں سے عبارت ہے۔ اقبال شفیع نے خطبہ کی تاریخ کا حوالہ اور لیکچر کے موضوع سے متعلق فقرے اصغر عباس سے اخذ کیے ہیں۔ اس کتاب کی طرف پروفیسر محمد جہانگیر عالم نے ہمیں متوجہ کیا تھا۔

(۴) پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد ۵ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقا (۱۹۴۸ء - ۱۹۴۷ء)

زاہد چوہدری (تکمیل و ترتیب حسن جعفر زیدی) نے لکھا ہے: تالیف: زاہد چودھری تکمیل و ترتیب حسن جعفری زیدی، س ن (دیباچہ محررہ ۸ جولائی ۱۹۹۱ء)

> "علامہ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے ایک تقریر کی تھی۔ صفحہ ۱۷۸"۔

پہلی بار اس واقعہ سے روشناس ہونے والا قاری بے قصور ہوگا اگر وہ سمجھے کہ اقبال نے متذکرہ عنوان سے اُردو میں تقریر کی تھی۔ ضبط تحریر میں آیا ہوا انگریزی خطبہ نہیں پڑھا تھا۔ اسی کتاب میں تقریباً ساٹھ صفحے آگے جا کر یہ لکھا ہے:

> "....۱۸۹۹ء میں انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں نالۂ یتیم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کی تھی جس میں ..... ص ۳۹-۲۳۸"۔

تاریخ کی ایک کتاب عام قاری اور طالب علم کے لیے کتنی معتبر ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال متذکرہ اقتباس کی حامل تاریخ کی یہ کتاب ایک مورخ نے تحریر کی ہے اس اقتباس میں تاریخی طور پر دو باتیں غلط ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم نالۂ یتیم ۱۸۹۹ء میں نہیں بلکہ ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو پڑھی تھی باقیات اقبال بار سوم ۱۹۷۸ء ص ۳۴) دوسری یہ بات بھی غلط ہے کہ اقبال نے ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ میں تقریر کی تھی۔ دراصل یہاں تقریر سے مراد ۱۹۱۱ء کا خطبہ ہے ہم ۱۹۰۱ء کو کتابت کی غلطی تسلیم کرنے پر آمادہ تھے مگر سیاق و سباق میں دیکھتے ہوئے کمپوزر کو موردِ الزام ٹھہرانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ محض لاپروائی اور بے توجہی کی ایک مثال ہے۔

ممکن ہے ڈھونڈنے سے دو چار اور ایسی مثالیں مل جائیں جنھوں نے اقبال کے خطبہ علی گڑھ کے لیے ۱۹۱۱ء کی تاریخ اختیار کر لی ہو۔ معلوم ہوتا ہے ۱۹۱۰ء کا جادو ٹوٹے ٹوٹتے ٹوٹے گا کیونکہ ابھی تک ۱۹۱۰ء کا چلن باقی ہے مثلاً زیب النساء کی تالیف "اقبال کی اُردو نثر۔ ایک مطالعہ" ایم اے کا تحقیقی مقالہ ہے اس کے نگران ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ہیں۔ اس مقالہ کا باب ۳ بعنوان "اُردو مضامین" پیش نظر ہے اس میں بہت سی باتیں توجہ طلب ہیں بہر حال "مقالاتِ اقبال" طبعِ اول کا جائزہ لیتے ہوئے چوتھے نمبر پر ذیلی عنوان

"ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، ۱۹۱۰ء" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون "مضامینِ اقبال" میں چھپ کر سامنے آچکا ہے لیکن اس مضمون کے سلسلے میں مرتب کی غلطی قابلِ اصلاح ہے۔ وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ علامہ نے ۱۹۱۰ء میں جو لیکچر علی گڑھ میں Islam as a Social and Political Ideal پر دیا تھا۔ اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ اور مولانا نے علامہ کی موجودگی میں یہ ترجمہ اسلامیہ کالج لاہور کے برکت علی ہال میں پڑھ کر سُنایا مقالہ نگار نے بجا طور لیکچر کے غلط انگریزی عنوان کی نشاندہی کی ہے۔ اس سے پہلے ہاشمی صاحب اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ میں یہ غلطی سامنے لاچکے ہیں۔ معینی صاحب کے محولہ بالا پانچ چھ سطری بیان میں دو غلطیاں اور ہیں۔ جن کا ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر ہاشمی نے نوٹس نہ لیا تھا۔ اور اب یہ غلطیاں ۱۹۹۷ء میں شائع ہونے والی کتاب کی مولفہ کی نظر میں بھی نہیں آئیں۔ یاد رہے ۱۹۸۲ء اور ۱۹۹۵ء یا ۱۹۹۷ء میں علامہ کے لیکچر کی تاریخ ۱۹۱۰ء تسلیم کرنا درست نہیں۔ اسی طرح برکت علی ہال کا اسلامیہ کالج لاہور سے کوئی تعلق نہیں۔ برکت علی اسلامیہ ہال بیرون موچی دروازہ لاہور ایک الگ آڈیٹوریم تھا۔ حد یہ ہے کہ موچی دروازہ لاہور کے محمد عبداللہ قریشی نے بھی اس کی تردید نہ کی جو مقالاتِ اقبال طبع دوم ۱۹۸۸ء سے شریک مرتب ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے ہوش مند اقبال شناس مضمون "علامہ اقبال اور مسلم ثقافت کے خدوخال" مطبوعہ ۱۹۹۵ء جو ان کے مجموعہ مضامین "اقبال چند نئے مباحث" اشاعت ۱۹۹۷ء میں شامل ہے۔ میں بھی خطبہ علی گڑھ کی تاریخ ۱۹۱۰ء ہی لکھی ہے۔

"خطبہ علی گڑھ کے اس جائزے سے سراج اورنگ آبادی کی غزلوں کا یہ ٹکڑا لپک کر سامنے آتا ہے"

جو رہی سو بے خبری رہی

حواشی:

(۱) ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین (ناشر) ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ بزمِ اقبال، لاہور ۱۹۹۴ء۔ ص ۴

(۲) اقبال اکیڈمی لاہور کے نام سے ایک ادارہ چند محبان اقبال نے قائم کیا تھا۔ کتابچے شائع کرنے کے بعد بند ہوگیا۔ جبکہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، وزارت تعلیم پاکستان کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔

(۳) رضیہ فرحت بانو، خطبات اقبال، حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء۔ ص ۷

(۴) ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ (تعارف محمد شاہ) اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۴۹ء ص ۲

(۵) محمد عبداللہ قریشی، تمہید، "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" ناشر، محمد عبداللہ قریشی سیکرٹری انجمن معین السلام لاہور۔ ملتان ص ۲

(۶) ہاشمی ڈاکٹر رفیع الدین، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ اقبال کادمی لاہور ۱۹۸۲ء ص ۳۳۵

(۷) تاج تصدق حسین، مضامین اقبال حیدر آباد دکن طبع دوم

(۸) یوسف حسین خان ڈاکٹر ادارہ اشاعت اُردو حیدر آباد دکن طبع ثانی ۱۹۴۴ء

(۹) ایضاً ص ۲۵۳

(۱۰) اختر جونا گڑھی، قاضی احمد میاں اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء

(۱۱) اس کی تفصیل ہمارے طویل مضمون میں فراہم کی گئی ہے۔ اس تفصیل کو ایک الگ مضمون کی شکل بھی دی گئی ہے۔

(۱۲) معین سید عبدالواحد مقالات اقبال، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۶۳ء

(۱۳) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب میں اس نوٹ کا عکس شائع کیا ہے۔ اقبال کے نوشتہ فقرے ٹیڑھے اور دو کالم میں ہیں۔ اس سے اندازہ نہیں ہوتا اقبال نے مسودہ کے کس قوام پر یہ عبارت رقم کی ہے البتہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ اقبال نے یہ عبارت حاشیہ میں تحریر کی ہے۔

(۱۴) اقبال کا یہ انٹرویو پچاس پچپن برس سے اقبال کے مضامین، خطبات اور بیانات وغیرہ کے انگریزی مجموعوں اور حرف اقبال میں چھپ رہا ہے۔ کسی نے اب تک نہ پوچھا کہ نمائندہ پریس کون ہے۔ اس کا تعلق کس ایجنسی یا اخبار سے ہے یہ انٹرویو کب کس اخبار اور کسی مقام سے شائع ہوا تھا۔ ان معلومات کی غیر موجودگی میں اس انٹرویو کی ٹیکنیکل حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ ان خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس کو تحقیقی حوالہ بنانا کس حد تک جائز تھا؟ تحقیق کے فن، کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں غالباً اقبال سے نسبت کی بنا پر اس انٹرویو کو وقار اور اعتبار حاصل رہا۔ خوش قسمتی سے یہ اعتماد صحیح ثابت ہوا۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق نمائندہ پریس فضل کریم خاں درانی تھے جو لاہور سے Truth کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالتے تھے۔ وہ اقبال کے نیازمندوں میں تھے اور قادیانیوں کے بارے میں اقبال کے موقف اور بیانات کے مرشید تھے۔ تفصیل راقم کے طویل مضمون میں ملاحظہ فرمایا ہے۔ پروفیسر افضل حق قریشی نے بتایا ہے کہ فضل کریم خاں درانی پر ان کا مضمون "ارمغان وحید" میں زیر طبع ہے۔

(۱۵) ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ ۱۹۸۲ء ص، ن

(۱۶) ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین۔ اقبالیات کے تین سال اشاعت دوم مارچ ۱۹۹۳۔ ص ۵۲۱

(۱۷) ایضاً ص ۳۳-۳۴

(۱۸) عباس، ڈاکٹر مظفر مرتب ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مکتبہ عالیہ اُردو بازار لاہور س ن، ص ۶

(۱۹) ایضاً ص ۲۴

(۲۰) شیروانی، لطیف احمد (مرتب) حرف اقبال لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۲

(۲۱) پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (مرحوم) نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی بی اے کلاس کے ایک مضمون "اقبالیات" کے لیے یونٹ نمبر ۱۶ تحریر کیا ہے۔ اس میں "علامہ اقبال کے چند اہم نثری کارنامے کے زیر عنوان شق نمبر ۴ کا آغاز یہ ہے "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" یہ بھی ۱۹۱۰ء کی ایک تقریر ہے "اقبالیات یونٹ ۱۸-۳۱ شائع کردہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اشاعت اول ۱۹۸۰ء ص ۳۵۳

ایک ضمنی بات کسی صاحب نے "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کو اقبال کی اُردو نثر کا کارنامہ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ جو بالکل بجا ہے کیونکہ یہ ظفر علی خاں کا ترجمہ ہے۔

(۲۲) کامران، شاہد اقبال "ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ" جاوید پبلشرز فیصل آباد۔ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۵

(۲۳) "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" بزم اقبال لاہور ۱۹۹۴ء ص ۳

(۲۴) ایضاً انگریزی سیکشن، ص ۱

(۲۵) اصغر عباس سر سید، اقبال اور علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۱۹۸۷ء ص ۳۸

(۲۶) راقم کا طویل مضمون مکمل ہو چکا تھا اس نے اقبال کے ایک دوسرے مضمون میں قرآنی آیات کے انگریزی اقتباسات کے نمبروں کے لیے سہیل عمر صاحب سے رجوع کیا۔ انھوں نے کمال توجہ سے راہنمائی فرمائی۔ راقم الحروف کی زیر استعمال شروانی کا ۱۹۷۷ء کا ایڈیشن تھا گذشتہ چار برس بوجہ علالت علمی ادبی اور کتابی دنیا سے بے دخل رہا۔ سہیل عمر نے شیروانی کی speeches

کے ۱۹۹۵ء کے ایڈیشن اور اضافہ شدہ حواشی کی طرف توجہ دلائی۔ اس کتاب کی کم و بیش سارا ایڈیشن برساتی سیلاب کی زد میں آگیا تھا۔ چند آب دیدہ نسخوں میں سے ایک نسخہ راقم الحروف کو فراہم کیا گیا۔

(۲۷) راقم الحروف نے اپنے طویل مضمون میں اس مقالے کے مطبع و مصدر کا سراغ لگایا ہے۔

(۲۸) دوسرے ممتاز اقبال اسکالرز جن کا ذکر نہیں آیا مگر وہ بھی ۱۹۱۰ء ہی کو درست تاریخ مانتے ہیں یا ان کے حوالے درج کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہاشمی اور ایک ایک جلد میں خطبہ علی گڑھ کے انگریزی اور اردو ترجمہ کے اکھٹے متون کے مرتبین کی طرح بعض ارباب علم یہ جانتے ہوئے بھی کہ نئے ماخذ کے مطابق اقبال نے اپنا لیکچر ۱۹۱۱ء میں دیا تھا وہ ۱۹۱۰ء کی تاریخ پر مصر ہیں مثلاً ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود حیاتِ اقبال کا وسطی دور، اشاعت اول ۱۹۸۱ء میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۰ء میں ایک انگریزی خطبہ بعنوان "مسلم کمیونٹی ایک معاشرتی مطالعہ" میں جو علی گڑھ میں دیا گیا تھا اقبال نے ایک مقام پر قادیانی فرقہ کو پنجاب میں خالصتاً مسلم طرز فکر کا طاقتور مظہر بیان کیا"۔ ص ۱۷۰

مولف و مرتب کتاب ہذا نے اس پر اپنے نوٹ میں لکھا ہے:

"اس مقالہ کا اصل مسودہ بعنوان "مسلم کمیونٹی، ایک معاشرتی مطالعہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے اور اس کے صفحہ اول کے حاشیہ پر اقبال کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا، انگریزی میں ایک وضاحتی نوٹ بھی ہے۔ جس میں تحریر کرتے ہیں"۔

یہ لیکچر علی گڑھ میں ۱۹۱۱ء میں دیا گیا" ص ۲۹۶ نوٹ، اس کتاب کا صفحہ ۱۸۸ اور ۲۹۸ بھی ملاحظہ فرمایئے ٹ

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے بھی اپنی کتاب مقاصد اقبال ایڈیشن اول ۱۹۸۱ء میں علی گڑھ کے خطبہ کی تاریخ ۱۹۱۰ء لکھی ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی مقدمہ شذرات فکر اقبال، میں بہ تاریخ ۱۹۱۰ء ہی لکھتے ہیں۔ دیکھیے شذرات فکر اقبال مجلس ترقی ادب لاہور طبع دوم ۱۹۸۳ء ص ۱۹

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی تالیفات، ظفر علی خاں ادیب و شاعر ۱۹۶۷ء اقبال کا ذہنی ارتقا ۱۹۷۸ء ظفر علی خاں، حیات، خدمات و آثار ۱۹۹۳ء کتابچہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر (تمہید) ۱۹۹۴ء اور جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار طبع اول ۱۹۹۶ء میں خطبہ کا اصل انگریزی متن بھی شامل کیا ہے جو اقبال کے ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے نوٹ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا فقرہ ہی یہ ہے: This lecture was dilivered at Aligarh in 1911. speechese writing and لطیف احمد شیروانی کی statement of Iqbal کے چوتھے ایڈیشن ۱۹۹۵ء کے حاشیہ نگار نے فٹ نوٹ میں اقبال کا نوٹ بھی شائع کیا ہے اور اس کتاب میں خطبہ کے پہلے صفحہ کے فٹ نوٹ میں تاریخ ۱۹۱۰ء ہی لکھی ہے۔ ص ۱۱۸

بشیر احمد ڈار کی کتاب Articles on Iqbal ۱۹۹۷ء میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے شائع کی۔ اس کتاب کے مدیر اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے کارکن ہیں۔ اس میں شامل آرٹیکل Iqbal's prose works میں خطبہ دینے کی تاریخ آغاز ۱۹۱۰ء بتائی گئی ہے۔ ص ۲۶۵

اقبال کی فارسی گوئی پر اعتراضات کا جائزہ

پروفیسر ایوب صابر

اقبال کی فارسی گوئی پر متعدد ہندو اہلِ دانش نے اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں سچدانند سنہا، امرناتھ جھا، اقبال سنگھ (سکھ) اور کے این سُدھ وغیرہ شامل ہیں۔ اقبال پر لکھنے والے مستشرقین میں سے رالف رسل، اقبال کی فارسی گوئی پر، معترض ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں کہ چند وجوہات سے اقبال نے فارسی میں بھی شاعری کی۔ انھوں نے نہ صرف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو مخاطب کرنا چاہا بلکہ وہ اس وسیع علاقے کے مسلمانوں سے بھی ہم کلام ہونے کے خواہش مند تھے جس میں افغانستان، ایران، اور وسطی ایشیا شامل ہیں جہاں دوسو سال پہلے تک فارسی، نظم و نسق اور ثقافت کی زبان تھی۔ اقبال غالباً اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ زبان اب بھی وہی فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت ذرا اس سے مختلف تھی۔ وہ فارسی میں یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ اس زبان کے ذریعے انھیں اب بھی عالم اسلام کے وسیع و عریض علاقوں تک رسائی ہوجائے گی۔(۱)

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے پورا ایک باب اقبال کی فارسی گوئی اور فارسی شاعری کی قدر و قیمت پر اعتراضات کے لیے وقف کیا ہے۔ دوسرے ہندو اہلِ قلم نے انہی کے اعتراضات کو دہرایا ہے۔ سنہا لکھتے ہیں کہ اردو کی جگہ فارسی میں زیادہ تر شاعری کر کے اقبال نے نہ صرف ہندوؤں کو بلکہ بیشتر ہندی مسلمانوں کو بھی اپنی شاعری کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے محروم کردیا۔ سنہا نے سوال اٹھایا کہ کیا غالب سمیت، اپنے بیسیوں پیش روؤں کی طرح، اردو کی جگہ فارسی میں شاعری کر کے، اقبال فائدے میں رہے؟ سنہا نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا ہے۔

سنہا کی رائے ہے کہ بقول براؤن ہندوستان میں بابو فارسی لکھی گئی جس طرح کہ بابو انگریزی لکھی گئی۔ سنہا نے براؤن کے بیان کردہ ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعدد عیب گنائے ہیں۔ سنہا لکھتے ہیں کہ براؤن نے اپنی دو ہزار صفحات کی Litrary History of Persia. میں ہندوستانی شعرا میں سے صرف خسرو پر چار سطریں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر سنہا کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اچھی شاعری صرف مادری زبان میں کی جاسکتی ہے۔ اس رائے کو میکالے کے قول سے مستند بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری کو نہ ہندوستان اور نہ فارسی جاننے والے ممالک کی آئندہ نسلیں پڑھیں گی۔ اقبال کے فارسی شعری مجموعے معلمانہ اور ناصحانہ ہیں۔ فلسفیانہ اور دینی موضوعات پر مشتمل۔ ان میں جذبہ اور متاثر کرنے والی استعداد نہیں ہے۔

ڈاکٹر سنہا نے جس اعتراض کو بار بار دہرایا ہے اور جسے ناقابلِ تردید بنانے کے لیے سات آٹھ صفحات وقف کیے ہیں وہ یہ ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری کو ایران نے قبول نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ایران کے ثقافتی وفد کی شہادت پیش کی ہے جو ۱۹۴۴ء میں دہلی آیا۔ وفد کے سربراہ، علی اصغر حکمت، نے کہا کہ ایران میں اقبال، وسیع پیمانے پر، متعارف نہیں ہے۔ اس کا نام صرف چند

ادبی حلقوں تک محدود ہے۔ اقبال کے مقابلے میں ٹیگور کو سارا ایران جانتا ہے۔ وفد کے ایک اور رکن پروفیسر ابراہیم پور داؤد نے کہا کہ "اقبال ایک مقامی شاعر ہے جبکہ ٹیگور کی شخصیت عظیم ہے"۔ سنہا نے علامہ اقبال کا موازنہ عابد پشاوری سے بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہونے کے باعث نیز سادہ اسلوب کی بدولت، ایران میں، عابد پشاوری کو مقبولیت حاصل ہے جبکہ ان صفات کی غیر موجودگی کے باعث اقبال ناکام رہا۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب Modern Persian Poetry میں اقبال کا کوئی ذکر نہیں جبکہ پشاوری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔(۲)

(۲)

اقبال کی فارسی گوئی پر ڈاکٹر سنہا کے اعتراضات کا جائزہ لینے سے پہلے ایک جوابی اعتراض کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مرزا یار جنگ نے سنہا کی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "جب ہم ڈاکٹر سنہا کی ساری زندگی کے علمی ذخیرے کا جو انگریزی زبان میں ہے، ان کی مادری زبان کے سرمائے سے موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں اقبال ہی کی طرح کا فرق ان کے ہاں بھی نظر آتا ہے اور غالباً اسباب بھی وہی ہیں"۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے، عبدالمالک آروی نے، حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے:

> "یار جنگ نے بڑے مہذب، شائستہ اور نرم لہجہ میں اقبال کے غیر ملکی زبان میں لکھنے کا اتنا زوردار جواب دیا ہے کہ میرا خیال ہے ڈاکٹر سنہا کو چاہیے تھا کہ اپنا اعتراض کتاب سے نکال دیتے"۔(۳)

ڈاکٹر سنہا نے براؤن کے حوالے سے غیر متعلق باتیں لکھی ہیں۔ براؤن نے ایران کی ادبی تاریخ لکھی ہے نہ کہ برصغیر کی۔ "لہذا ہندوستانی فارسی ادب ان کے موضوع سے خارج تھا"۔ اس کے علاوہ بقول پروفیسر محمد شریف "اقبال کی تمام اہم فارسی نظمیں براؤن کی کتاب کی اشاعت کے بعد لکھی گئیں لہذا اگر پروفیسر براؤن اپنی کتاب میں ہندوستان کے فارسی شعر کا ذکر کرنا بھی چاہتے تو اقبال کی نظمیں اس میں شامل نہ ہو سکتیں"۔(۴)

تاہم، بعد میں، پروفیسر براؤن نے "اسرار خودی" پر تبصرہ لکھا جو رائل ایشاٹک سوسائٹی لندن کے جریدے میں شائع ہوا۔ اس تبصرے میں موصوف نے "اسرار خودی" کو مسلمانوں کے فکر و کردار پر دور رس اثرات کا حامل بتایا ہے اور ہندوستانی فارسی شاعری کے کسی عیب کی نشاندہی نہیں کی۔(۵) کلامِ اقبال، برِصغیر کی، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کی، روایتی شاعری کے عیوب سے پاک ہے۔ یہی نہیں اقبال نے، شاعری سمیت، جملہ اصلاح طلب فنون کے عیب خود گنائے ہیں اور ان کی اصلاح پر پوری توجہ صرف کی ہے۔(۶)

اقبال کی مادری زبان پنجابی تھی۔ انھوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں لکھا۔ شاعری اُردو اور فارسی میں کی۔ ۔ڈاکٹر سنہا کی منطق کے مطابق اقبال کو شاعری صرف پنجابی میں کرنا چاہیے تھی تاکہ "اچھی شاعری" ہو سکتی۔ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری نہ صرف اچھی ہے بلکہ اسلوب اور فکر دونوں کے اعتبار سے بہترین شاعری ہے۔ ڈاکٹر سنہا نے لارڈ میکالے کا بے کار سہارا لیا ہے۔ اس سلسلے میں خود علامہ اقبال نے، ایک گفتگو کے دوران، حسبِ ذیل رائے ظاہر کی ہے:

> "میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا۔ خواہ کوئی زبان ہو، صرف مشق ہونی چاہیے۔ ہر ایک زبان میں لکھا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو خیال ہے"۔(۷)

ٹیگور سے اقبال کا موازنہ بجا لیکن عابد پشاوری سے بے جا ہے۔ ایران جو اس وقت مغربیت کے آگے سرنگوں تھا، انقلاب کے باعث، مغرب کے لیے چیلنج بن گیا۔ وہاں اب جو اہمیت و مقبولیت علامہ اقبال کو حاصل ہے، وہ ٹیگور یا عابد پشاوری کو حاصل نہیں۔ ڈاکٹر سنہا زندہ ہوتے تو، بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر، اپنے موازنوں پر کف افسوس ملتے رہ جاتے۔ ان کی دانش مستقبل کے امکانات کے حوالے سے نارسا ہے۔ علامہ اقبال کے آئینہ ادراک میں مستقبل کا عکس ہوتا ہے۔(۸) چنانچہ ان کا حسبِ ذیل شعر اہلِ ایران میں بہت مقبول ہے:

می رسد مردی کہ زنجیرِ غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما(۹)

(۳)

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اقبال کے فارسی کلام پر جس اعتراض کو تفصیل سے لیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایران نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کا موقف ہے کہ اس سلسلے میں صرف ایرانیوں کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے چنانچہ اُنھوں نے ایرانی وفد کی شہادت پیش کی۔ کبیر احمد جائسی نے پورداؤد کے بیان کو درست قرار دیا ہے تاہم وہ لکھتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد۔ پاکستانی سفارت خانے نے ایران میں یوم اقبال منانا شروع کیا تو کلام اقبال کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ مطالعہ اقبال کے باعث فضا میں تبدیلی آئی۔ ملک الشعرا بہار نے کہا:

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاراں برگزشت

یہ شعر ایران میں بہت مشہور ہوا۔ اقبال پر دسیوں بزرگ اور نوجوان ادیبوں نے لکھنا شروع کیا۔ ان میں مذکورہ ایرانی وفد کے سربراہ علی اصغر حکمت شامل تھے۔ چنانچہ اقبال ایران میں غیر معروف شاعر نہ رہے۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے فکری نقیب ڈاکٹر علی شریعتی نے فکر اقبال کو اپنا راہبر بنا کر ایران کے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی۔(۱۰)

رفتہ رفتہ ایران میں اقبال شناسی کو فروغ حاصل ہوا، چنانچہ دہلی یونی ورسٹی کے ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے ایک مضمون میں، اہل ایران کی، اقبال پر لکھی ہوئی، اکتیس کتابوں اور چھبیس مقالات کی فہرست ۱۹۸۲ء میں دی تھی۔(۱۱) اس تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔

اقبال کے بارے میں ملک الشعرا بہار کی رائے اوپر نقل ہوئی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی کچھ اور سرکردہ شخصیات کی آرا بھی نقل کر دی جائیں۔ اس سے ایران میں اقبال کی مقبولیت اور ان کی فارسی شاعری کے معیار کا اندازہ ہو سکے گا۔

ڈاکٹر خطیبی نے پچاس کی دہائی کے اواخر میں اردو کالج کراچی میں، علامہ اقبال کی تصانیف اور اسلوبِ شعر کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی نے کیا۔ ڈاکٹر خطیبی لکھتے ہیں کہ سبک ہندی میں رفتہ رفتہ بے وقعت اور بودے مضامین شامل ہوتے گئے جس سے یہ سبک انحطاط پذیر ہوتی گئی۔ اقبال پر سبک ہندی کے مصائب واضح ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے فارسی شاعری کے نیم مردہ چراغ کو پھر سے روشن کیا اور اسے اس قابل بنایا کہ ایرانیوں کی آنکھوں کو بھی روشن کر دے۔ فارسی زبان کے شعرا میں، بشمول ایرانی شعرا، کمالِ معنی کے اعتبار سے، اقبال کو بڑا ہی گرانمایہ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ ان کے فارسی کلام

نے خود فارسی زبان کے مقام و مرتبہ کو بڑھا دیا ہے۔(۱۲) ڈاکٹر خطیبی نے اقبال کے اسلوب کو "سبک اقبال" کا الگ نام دیا ہے جو بقول محمد وصی اختر کسی اہلِ زبان کی جانب سے برصغیر کے کسی شاعر کو دیا گیا سب سے بڑا خراجِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی نے اقبال کو "مجدد و احیا کنندہ شعر و ادبِ فارسی" کا خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔(۱۳) ڈاکٹر علی شریعتی کے نزدیک جس شخص کے اندر وہ تمام انسانی جہتیں مجتمع ہو جائیں جو عام طور پر کسی ایک فرد میں جمع نہیں ہوتیں وہ "علی گونہ" کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر شریعتی نے اقبال کو "علی گونہ" کہا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کو "مصلح قرنِ آخر" قرار دیا ہے۔(۱۴) اہلِ ایران بالعموم معترف ہیں کہ اقبال نے امام خمینی کی قیادت اور ایرانی انقلاب کی پیش گوئی پچاس برس پہلے کر دی تھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کا خواب پورا ہو گیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ دیگر انقلابی راہنماؤں کے ساتھ ساتھ ایرانی قوم نے اپنی لہو رنگ تحریک کے دوران، فکر اقبال کی کرنوں سے بھی روشنی حاصل کی ہے۔(۱۵) ایران کے سابق صدر اور موجودہ روحانی پیشوا علی خامنائی نے اقبال کی فارسی شاعری کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

> "اقبال کا فارسی کلام بھی (اردو کلام کی طرح) میرے نزدیک شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کسی کی بھی نشان دہی نہیں کی جا سکتی، جو فارسی میں شعر کہنے میں اقبال کی خصوصیات کا حامل ہو۔"(۱۶)

(۴)

اقبال کی فارسی گوئی پر دسیوں صاحبان نے مخالفانہ یا موافقانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ گویا یہ سوال اہمیت رکھتا ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری کا جواز کیا ہے۔ اس سوال پر تین پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ فارسی شاعری کی بدولت کلامِ اقبال کا دائرہ اثر بڑھا ہے یا نہیں؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر اقبال فارسی شاعری نہ کرتے تو کیا اتنی مقدار کے برابر ان کے اردو کلام میں اضافہ ہو جاتا؟ تیسرا پہلو یہ ہے کہ تخلیق کار کو ذریعہ اظہار کے انتخاب کا حق اپنی پسند اور ترجیح کے مطابق ہے یا نہیں؟

سید سلیمان ندوی، خلافت وفد میں شامل ہو کر، یورپ گئے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ فرانس میں جب ہماری ملاقات ذکاء الملک (سابق وزیر تعلیمات، ایران) اور علامہ عبدالوہاب قزوینی سے ہوئی اور ملی نشاۃ ثانیہ پر گفتگو ہوئی تو ہم نے علامہ اقبال کا ذکر کیا۔ محمد علی جوہر نے "اسرار" اور "رموز" کے اپنے نسخے ان کو مطالعے کے لیے دیے۔ وہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے اور میں نے محسوس کیا کہ فارسی زبان نے اقبال کے دائرہ اثر کو کتنا بڑھا دیا ہے۔(۱۷) میاں محمد شریف لکھتے ہیں کہ مجھے اردو کی جگہ اقبال کی فارسی گوئی پر افسوس تھا لیکن میں غلطی پر تھا۔ ہندوستان سے باہر فارسی کا مقام اردو سے بلند تھا اور عالمِ اسلام تک پیام اقبال کی رسائی کے لیے فارسی زیادہ موزوں تھی۔ دوسرے یہ کہ کلاسیکی فارسی اردو سے قدیم تر اور وسیع تر تھی۔(۱۸) حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان نے اقبال کے دائرہ اثر کو وسعت دی ہے۔(۱۹) فارسی عالمِ اسلام کی اہم زبان ہے۔ رالف رسل نے اقبال پر خوش فہمی کا جو الزام عائد کیا ہے، وہ بے جواز اس لیے ہے کہ ایران، شمالی افغانستان اور تاجکستان میں، کلام اقبال، لوگ اپنی زبان میں پڑھتے ہیں۔ علاوہ ازیں مشرق و مغرب میں فارسی جاننے والے، اقبال کے فارسی کلام سے، براہ راست استفادہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مغرب کے ایک صاحب علم نے "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس سے اقبال یورپ اور امریکہ میں متعارف ہوئے۔

شیخ عبدالقادر "بانگِ درا" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ جوں جوں اقبال کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔ بقول عبدالسلام ندوی "فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات ادا کرنے کے لیے دنیا

کی زبانوں میں فارسی زبان سے زیادہ بہتر زبان نہیں۔" (۲۰) چنانچہ ایک طرف فارسی زبان کی ایک خاص استعداد اور دوسری طرف اقبال کا فارسی کی طرف خصوصی میلان پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ اقبال کی اپنی تحریروں سے دونوں امور پر روشنی پڑتی ہے۔ عمر امی کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۱۵ء میں اقبال لکھتے ہیں کہ "فارسی کی طرف میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ کہ دل کا بخار اردو میں نہیں نکال سکتا۔" (۲۱) "اسرار خودی" کی تمہید میں اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ اردو میٹھی زبان ہے لیکن فارسی اس سے زیادہ میٹھی ہے۔ فارسی کے جلوے نے میری فکر کو مسحور کر دیا ہے اور میرا قلم نخل طور کی شاخ بن گیا ہے۔ میرے فکر بلند کی فطرت سے فارسی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ (۲۲)

اسلامی تمدن پر فارسی میں لکھنے کی روایت رہی ہے۔ اقبال کے مرشد، مولانا روم، ترکی الاصل تھے لیکن مثنوی فارسی میں لکھی۔ علامہ اقبال کے والد کی فرمائش بھی یہی تھی کہ بوعلی قلندر کی طرز پر فارسی میں مثنوی لکھی جائے۔ (۲۳) یہ جملہ امور "اسرار خودی" کو فارسی میں لکھنے کا باعث بنے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدا میں اقبال اپنا پیغام خواص تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ (دیکھیے حاشیہ ۱۹) اقبال لٹریری ایسوسی ایشن، لندن، کے اجلاس میں اقبال نے کہا کہ بلاشبہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔ (۲۴) یہ باتیں پیشِ نظر رکھی جائیں تو ان لوگوں کا خیال حقیقت پسندی پر مبنی نہیں معلوم ہوتا جو یہ کہتے ہیں کہ اگر اقبال فارسی میں شاعری نہ کرتے تو اس قدر اردو شعری ذخیرے میں اضافہ ہو جاتا۔ اس سلسلے میں اقبال کا ایک فقرہ بطور خاص قابلِ توجہ ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں:

> "ایک مرتبہ میں نے ہمت کر کے ڈاکٹر صاحب پر یہ "جرح" کر ڈالی کہ آپ نے اردو میں لکھنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ فارسی میں لکھنا بجا، مگر اردو کا بھی تو کچھ حق تھا۔ (یہ اس زمانے کی بات ہے جب "پیام مشرق" کے بعد "زبور عجم" اور "زبور عجم" کے بعد "جاوید نامہ" شائع ہوئی) ڈاکٹر صاحب میری اس جسارت پر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ بالآخر انھوں نے انگریزی میں فرمایا: "It comes to me in persion" (مجھ پر شعر وارد ہی فارسی میں ہوتا ہے)" (۲۵)

(۵)

فارسی شاعری کے جواز کا تیسرا پہلو شاعر کے حق انتخاب کا ہے۔ اقبال سنگھ کا بیان ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری کے باعث اردو کا بہت نقصان ہوا تاہم اقبال کی فارسی شاعری کے بارے میں معترضانہ فیصلے منافقانہ ہیں۔ (۲۶) اقبال سنگھ کی اس رائے کا اطلاق ڈاکٹر سنہا پر ہوتا ہے۔ سنہا کا اعتراض صرف یہ نہیں ہے کہ اقبال نے فارسی شاعری کیوں کی بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کی اردو شاعری فارسی آمیز کیوں ہے۔ سنہا کا مطالبہ ہے کہ اقبال "شکتی، شانتی" اور "بھگتوں" والی اردو لکھتے۔ (۲۷) غرض یہ کہ اقبال اردو میں وہ ذخیرۂ الفاظ استعمال کرتے جن سے ہندو مانوس ہیں اور وہ ذخیرۂ الفاظ استعمال نہ کرتے جن سے مسلمان مانوس ہیں۔ یہ سارا منافقانہ سیاسی چکر ہے جو ہندی قومیت پر منتج ہوتا ہے۔

اردو اور فارسی دونوں مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اقبال کا شعری ذریعۂ اظہار ان کے مقاصد، پسند اور سہولت کے مطابق ہے۔ اقبال کے مخاطب اولاً مسلمان ہیں اور پھر عالمِ انسانیت جس میں ہندو شامل ہیں۔ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان تھی۔ ہندوؤں نے اردو چھوڑ کر ہندی تشکیل دی اور اسے اختیار کیا۔ اب وہ چاہیں تو کلامِ اقبال کو ہندی میں ترجمہ کرالیں لیکن اقبال کے حقِ انتخاب پر معترض ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

حواشی اور حوالے:

(۱) اقبال اور ان کا پیغام، پروفیسر رالف رسل صفحات ۵، ۱۸

(۲) Iqbal: The poet and his message، ڈاکٹر سچدانند سنہا، صفحات ۱۱۶ تا ۱۳۰

(۳) اقبال کی شاعری، صفحہ ۲۰۶

(۴) مقالات شریف، صفحہ ۹۶

(۵) دیکھیے، The sword and the sceptre مرتبہ رفعت حسن، صفحہ ۲۹۱

(۶) دیکھیے، "ادبیات، فنون لطیفہ" کے عنوان کے تحت "ضرب کلیم" کی منظومات

(۷) صحیفۂ اقبال، مرتبہ یونس جاوید، صفحہ ۳۲

(۸) علامہ اقبال کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

(کلیاتِ اقبال، صفحہ ۳۵۶)

(۹) دیکھیے، کبیر احمد جائسی کا مضمون "عصر حاضر کے ایران میں اقبال کی معنویت" مشمولہ اقبالیات "۲، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرینگر صفحہ ۸۸

(۱۰) ایضاً، صفحات ۶۹ - ۷۰

(۱۱) "اقبال ایران میں"، مشمولہ "اقبال - فکر و فن" - مرتبہ سید اطہر شاہ، صفحات ۱۰۵ تا ۱۱۰

(۱۲) دیکھیے، اقبال ۸۶ء، مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت، صفحات ۲۰۶ تا ۲۰۸

(۱۳) اقبال کی فارسی شاعری، محرکات و آغاز، "مشمولہ اقبال - فکر و فن" صفحہ ۱۸۵

(۱۴) ڈاکٹر علی شریعتی کی اقبال پر لکھی گئی ایک کتاب کا نام "مصلح قرنِ آخر" ہے۔

(۱۵-۱۶) "اقبال: مشرق کا بلند ستارہ"، صفحات ۵، ۱۱

(۱۷) اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، مرتبہ اختر راہی، صفحہ ۴۰

(۱۸) مقالات شریف، صفحہ ۹۵

(۱۹) اقبال نے نوع انسانی سے بالعموم اور مسلم اقوام سے بالخصوص خطاب کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے پیغام کے دائرہ اثر کی وسعت کو ضروری خیال کرتے تھے۔ تاہم "اسرار خودی" کی پیش کش کے وقت وہ اپنے پیغام کو برصغیر کے خواص تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ اقبال لٹریری ایسوسی ایشن لندن کے اجلاس میں اقبال نے یہ دلچسپ راز افشا کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اکثر یوں ہوا ہے کہ دقیق خیالات بغیر کسی واسطے کے ظاہر کیے گئے تو مفہوم و مطلب کچھ کا کچھ ہو گا۔ میرے اول مخاطب ہندوستان کے خواص تھے تاکہ وہ میرے پیغام کو صحیح طور پر سمجھیں اور اسے اچھی طرح اخذ کرنے کے بعد عوام تک پہنچائیں۔

(دیکھیے، روزگار فقیر۔ صفحہ ۱۹۹، نیز سفرنامہ اقبال، صفحہ ۸۹)

(۲۰) اقبال کامل، صفحہ ۱۶۲

(۲۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد اول، صفحہ ۳۳۳

(۲۲) اصل فارسی اشعار حسبِ ذیل ہیں:

گرچہ ہنری در غدوبت شکراست
طرز گفتارِ دری شیریں تراست
فکر من از جلوہاش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخل طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

(کلیاتِ اقبال فارسی، صفحات ۱۱-۱۲)

(۲۳) دیکھیے، مکتوب بنام عطیہ فیضی، مورخہ ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، صفحہ ۲۲۵
(۲۴) سفرنامۂ اقبال، محمد حمزہ فاروقی، صفحہ ۸۹
(۲۵) اقبال کی شخصیت اور شاعری، صفحہ ۴۵
یہ حسنِ اتفاق ہے کہ "جاوید نامہ" کے بعد اقبال کے دو شعری مجموعے، "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" شائع ہوئے۔ "بانگِ درا" اور ارمغانِ حجاز کے حصہ اردو سمیت یہ شعری سرمایہ، اردو دان دنیا کے لیے، باعثِ اطمینان ہونا چاہیے۔
(۲۶) دیکھیے، The Ardent Pilgrim، صفحات ۴۳-۴۴
(۲۷) دیکھیے، Iqbal The poet and His message، گیارھواں باب، نیز صفحہ ۱۹۷

مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت حصہ اوّل =/۱۰۰ روپے، حصہ دوم =/۱۲۵ روپے، حصہ سوم =/۱۰۰ روپے

شائع کردہ
انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

اقبال کا ذوقِ محاربت

شاہدہ یوسف

اقبال کا ذوق محاربت کسی نفسیاتی پیچیدگی کا شاخسانہ نہیں۔ بلکہ زندگی کے اضطراری اور انحطاطی رویوں کا جواب ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی بساط پر وحدت الوجودیت، تصوف، رہبانیت، تپسیا اور برہمنیت کا منفی کھیل کھیلا جارہا تھا۔ زندگی کے اس قمارخانے میں فرد اور قوم اپنے مناصب جلیلہ کو بھول چکے تھے۔ اور اُمتِ مسلمہ تاریخ کے اس سفر میں ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح اپنے وجود پر خجل تھی۔ صورتِ حال کی اس سنگینی میں یونانی فلسفہ کے اسلامی فکر کے ساتھ اختلاط نے اور اضافہ کیا۔ علوم عقلیہ کے مباحث اور وجدانی عقیدوں کی پیکار نے ایمان بالغیب کے عقیدے پر شب خون مارا۔ معتزلہ اور اشاعرہ الہیاتی مباحث اور عقلی تفکر کے اکھاڑوں میں تبدیل ہوگئے۔ مفروضہ عقاید و مسائل کے انبوہ گراں میں فرد اور قوم کا جوہرِ خودی دب کر رہ گیا۔ مابعد الطبیعیاتی حقائق کے بارے میں میں یہ عقلی مجادلے ذہنی زرخیزیت mental fertility، اور ذہانت و فطانت یا، Intelectualism کا بہترین مظاہرہ ہونے کے باوجود اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک سعی بیکار یا، waste ful venture کا مصداق بن کر رہ گئے تھے۔ زندگی کے گرانبار اور شورید سر حقائق سے اُمتِ مسلمہ کی یہ گریز پائی ایک ملی سانحہ سے کم نہ تھی۔ منفی قسم کے تصوف اور خانقاہی اداروں کے فروغ نے زندگی کو مزید بے جہت و بے زمام کردیا۔ وحدت الوجودیت کے فلسفے کے لیے فرد اور قوم کے تشخص کو الہیاتی مباحث کی نذر کردیا۔ فکری اور اعتقادی زوال کے اس دور اہے پر ادب میں انحطاطی موضوعات اور اسالیب کے طغیان نے اُمتِ مسلمہ کے وجود کو شل کردیا۔ زندگی کے جہاد میں کمانِ ابرو، تیغ نظر اور دشنۂ مژگاں، مردان حُر، کی شمشریں تھیں جن کے بل بوتے پر وہ زندگی کی ہر جنگ جیتنا چاہتے تھے۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ یہ استعاراتی اور علامتی ہتھیار عشاق کے اسلحہ خانوں کی بجائے محبوب کے دستِ نازک میں تھے۔

سر قلم ہو کہ نئی زیست میسر آئے
دستِ کمسن میں ہے تلوار نجانے کیا ہو

ادب میں عجمیت اور لکھنوی روایات شعری کے اختلاط نے اسے ذہنی فروغ کا ذریعہ بنانے کی بجائے اعصاب اور قویٰ میں ہیجان پیدا کرنے کا وسیلہ بنادیا۔

کوئی لے آئے یاں اس کو بلا کے
بہانے سے کسی اور آشنا کے

(جرات)

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

(غالب)

غرضیکہ دین و دنیا اور عقل و نظر کے اس انحطاط سے اور تہذیبی اور عقلی زاوال یافتگی کے اس مرحلے میں اقبال نے اپنا شہرہ آفاق فلسفۂ خودی پیش کیا اور صدیوں کی اس متصوفانہ، فلسفیانہ اور ادبی سرگرمیوں کی محفل رامش گری کو درہم برہم کردیا اور عقلی اور تخیلی مباحث کے اس بیناخانے کو بیک قلم مسترد کردیا جس پر امت مسلمہ کی حیاتِ منفعل کے خجالت آمیز باب مرقوم تھے۔ اس ضمن میں وہ اپنے ایک مضمون "اسرارِ خودی اور تصوف" میں کہتے ہیں۔

خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں.... کہ وہ ایک ایک کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراضِ زندگی کے منافی ہے.... جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں (یعنی بہ حثیت صوفی ہونے کے) وہ حالت افراد و اقوام کے لیے جو اس زمان و مکاں کی دنیا میں رہتے ہیں نہایت ہی خطرناک ہے۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے جس کو وہ اپنے کمالِ فن سے شیریں کردیتے ہیں۔(۱)

منفی قسم کی تقدیر پرستی، متصوفانہ، شاعری کے نفیِ ذات پر مبنی موضوعات اور افلاطون کے مسلکِ گوسفندی کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ اور فرد و قوم کا رشتہ زندگی کی محکم اور صالح اقدار سے اُستوار کیا۔

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصد مستانہ خیز
باطلِ دیرینہ را غارت گرے
فتنہ در جیبے، سراپا محشرے(۲)

اقبال کے نزدیک، خودی، فرد اور قوم کی زندگی میں احساسِ ذات اور تعین کا ایک گراں مایہ جوہر ہے۔ وہ وصف فرد اور قوم کی ذات کے امکانات کو اس کی آخری صلاحیت و استعداد تک دریافت کرنے اور انھیں فروغ دینے سے عبارت ہے۔ ہر فرد کو اپنی ذات کے امکانات و مضمرات کی جستجو اور بازیابی کے لیے خودی کے نظام فلسفہ کے جانکاہ اور زہرہ گداز مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن تربیتی مراحل کے اس نظام سے بہرہ یاب ہونے سے پہلے فرد و قوم کے دل میں نو بہ نو مقاصد تخلیق کرنے ہونگے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے دل میں قوت و صداقت اور عشق و محبت کے زندگی بخش اور حیات آفریں جذبے پیدا کرنے ہونگے اس لیے کہ خودی ہی فرد اور قوم کی سرد مہر فطرت میں شرار زندگی پیدا کرتی ہے خودی کی فطرت عشق تپش اور تاب و تب حاصل کرتی ہے۔ اور

عشق سے ہی اس عالم امکاں کے فروغ اور تابش کا باعث بنتی ہے۔ خودی کی صلاحیتِ استعداد بڑھانے میں عشق کا جو کردار ہے اس پر اقبال یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

درجہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق
آبِ حیواں تیغِ جوہر دار عشق
از نگاہِ عشق خارا شق شود
عشقِ حق آخر سراپا حق شود
عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشم نوے، قلبِ ایوبے طلب

اس کے بعد وہ خودی میں ضعف پیدا کرنے والے عناصر سے متنبہ کرتے ہیں، یہ عناصر سوالی، اور "انحطاطی اجزا" رکھنے والے افکار و ادبیات ہیں اس کے بعد وہ خودی کی تربیت کا باضابطہ پروگرام شروع کرتے ہیں جس کا مرحلہ اول اطاعت، مرحلۂ دوم "ضبطِ نفس" اور مرحلۂ سوم نیابت الٰہی ہے۔ یہ تربیتی نظام اپنے اندر ایک حکمت عملی اور Strategy رکھتا ہے۔ یہ صدہا سال سے آزادہ روی اور فارغ البالی میں مبتلا امت مسلمہ کو آئین و ضوابط اور ریاضت و مشقت کا عادی بنانے کا پروگرام ہے۔ افراد میں انفرادی سطح پر ریاضت و جفاطلبی اور سخت کوشی و خطر پسندی کی عادات کے فروغ کا منشور ہے۔ جس کی بدولت ہر فرد کی تربیت یافتہ خودی اور اس کی صلاحیت و استعدادِ سخت کوشی قوم کی اجتماعی بقا اور قد و منزلت کا وسیلہ بن سکے گی۔ کہتے ہیں:

ہر کہ تسخیرِ مہ پروین کند
خویش را زنجیریٔ آئین کند
بادرا زندان کل خوشبو کند
قیدِ بُو را نافۂ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم
پیشِ آئینہ سرِ تسلیم خم
شکوہ سنجِ متقی آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو (۳)

تربیتی مراحل میں جہد و ریاضت اور سخت کوشی سے یہ عناصر فرد اور قوم کے ہاتھ لا الٰہ کی قوت کا عصا دیتے ہیں جس کی مدد سے طاغوتی طاقتوں اور فتنہ ہائے دوراں کے سامنے مومن بطورِ فرد اور امتِ مسلمہ بطورِ قوم کے سینہ سپر ہو جاتی ہے۔

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویاں را بدہ پیغام صلح (۴)

اقبال کے نظام افکار میں قوت و جبروت اور شکوہ و جلال زندگی کے ارتقائی عمل میں فرد و قوم کی معاونت کرتے ہیں اور یہ قوت و جلالت خودی کے اسی تربیتی نظام ریاضت و سخت کوشی کا ثمر ہے جس کے اجزائے ترکیبی میں خطر پسندی اور ذوقِ محاربت و مسابقت بھی شامل ہیں۔

"باک ہارڈٹ تاریخ میں طاقت کو سب سے زیادہ باعمل اور موثر دیکھتا ہے۔ فطرت کے ہر پہلو میں طاقت کمزور کو ہراساں و دہشت زدہ کئے ہوئے ہے اپنے آہنی پنجے میں جکڑے ہوئے ہے پوری انسانی تاریخ میں طاقتور ہمیشہ کمزور کو نیست و نابود کرتا ہے یا انھیں اپنا غلام بناتا آیا ہے" (۵)

علامہ اقبال بھی قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل میں قوت و ریاضت اور خطروں کے سامنے ڈٹے رہنے کی صلاحیت کو زندگی کی ایک کلیدی اور اساسی قدر سمجھتے ہیں۔ اور اپنی تجزیاتی صلاحیت کی بنا پر کہتے ہیں۔

زندگانی قوتِ پیدا ستے
اصل اُو از ذوق استیلاستے
عفوِ بیجا سردیٔ خونِ حیات
سکتہ در بیتِ موزونِ حیات
ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است
چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود
دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود
زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است
مدعی گر مایہ دار از قوت است
دعویٰ او بے نیاز از حُجت است (۶)

اقبال کے نزدیک قوت اور سخت کوشی میں حیات و بقا کا راز مضمر ہے۔ اپنے اس فلسفے کے ابلاغ میں انھوں نے تماثیل و حکایات سے بھی کام لیا ہے ایک پیاس سے از خود رفتہ پرندہ الماس کے چمکدار ٹکڑے کو پانی سمجھ کر اس پر چونچیں مارتا رہا لیکن چونکہ الماس کا ٹکڑا سخت کوشی و ریاضت کے جانکاہ مراحل سے گذر کر اپنے اندر قوت مدافعت اور مزاحمت کو پیدا کرچکا تھا اور اس کی خودی پختہ کار و مستحکم ہوچکی تھی لہذا پرندہ اس کے وجود کے اجزا کو تحلیل نہ کرسکا لیکن اس کے مقابلے میں قطرہ شبنم کی بے مائگی ناتوانی اور غیر تربیت یافتہ خودی مزاحمتی شعور کے فقدان کی وجہ سے پرندے کے منہ میں ٹپک کر اپنی ذات کی تحقیر کا باعث ہوئی مجنوں

گورکھپوری اپنی کتاب "ادب اور زندگی" میں لکھتے ہیں۔

"فرانس کا ایک مشہور ادیب اومان دی کانکو Edmand de concourt, جس کا انتقال گزشتہ صدی کے اواخر میں ہوا ایک جگہ لکھتا ہے اور ہر چار پانچ برس بعد دنیا کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے بربریت کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ دنیا تہذیب کے ہاتھوں فنا ہوجائے، کانکور کا مطلب جو کچھ بھی ہو لیکن وہ بے ساختہ ایک تاریخی حقیقت کا اظہار کر گیا ہے"(۷)

اقبال مصافِ حیات میں ان تاریخی حقائق کی بصیرت سے اپنی قوم کے ہر فرد کو جارح قوتوں کے توانا و فعال اور خطر پسند حریف کی حیثیت سے تیار کرنا چاہتے ہیں۔

"خودی کے ضمن میں اقبال نے یہ تحقیق کی ہے کہ نفیٔ خودی کی تعلیم کہاں سے پیدا ہوئی اور کن اسباب سے وہ بعض اقوام پر چھا گئی اس تحقیق میں اقبال نطشے سے متفق ہیں کہ یہ انحطاط یافتہ اور مغلوب اقوام کی ایجاد ہے۔ ان ست عناصر اقوام کو قوی اور جلیل اقوام کے مقابلے میں زندہ رہنے کی کوئی ترکیب سوجھنی پڑتی ہے"۔(۸)

اقبال امتِ مسلمہ کے ہر فرد کو سخت کوشی اور خطر پسندی کا درس دے کر اس کے قبضہ قدرت میں زمانے کی تلوار دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ممکناتِ زیست کو منصۂ شہود پر لاسکے۔ اور زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز، کے منشور پر عمل پیرا ہو کر طاغوتی طاقتوں کے سامنے اپنے ذوق پیکار اور خطر پسندی کا مظاہرہ کرسکے۔ اقبال نے اپنے اس فلسفے کی افادیت حکایت "الماس و زغال" سے بھی واضح کی ہے جس میں "الماس" کوئلے کو اپنی ذات کی برتری اور فضیلت سمجھتا ہے۔

می شود ازوے دو عالم تسخیر؟
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

درصلابت آبروئے زندگی است، ناتوانی، ناکسی، ناچنگی است، سخت کوشی اور ریاضت اس عالم کون وفساد میں آفاقی نظریات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخی عمل میں فعال اور جارح قوتوں کا ایک تاریخ ساز کردار رہا ہے۔ کوتاہ ہمتی کو فقر اور ضعف و ناتوانی کو عجز وانکسار کہنے والے تاریخ کے رواں دھارے میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ شوپنہار Schopenhaver، مہاتما بدھ، Buddha، اور کیتھولک چرچ، Catholic Church، کے زیر اثر فروغ پانے والی ربانیت زندگی کی مسکینیت اور بے چارگی کے سوا کوئی قابلِ قدر فریضہ انجام نہیں دے سکے ان کے برعکس نطشے Nietzsche جو طاقت کا پجاری اور قوت کا دلدادہ ہے۔ اپنے مثالی افراد میں اس قوت و جبروت کے عناصر دیکھنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے۔

"Good heavens, man you must learn to be go tougher Fiber, great men suffer greatly, and great sufferings are not to be regretted, because they are noble"(9).

نطشے کے یہ افکار اقبال کے فلسفہ سخت کوشی اور خطر پسندی پر مبنی افکار سے شہری مماثلت رکھتے ہیں صرف اس فرق کے ساتھ نطشے کا فلسفہ کسی اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں وہ اندھی طاقت کا پجاری ہے اور اس کے نظامِ افکار میں قوت محض کے مظاہر مقصود بالذات ہیں، اور زندگی کی غایات عالیہ کے حصول سے ان کا کوئی ربط وضبط نہیں۔

ضعف و ناتوانی مصافِ ہستی کی جہد و ریاضت میں ارتقا کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ڈاکٹر صدیق شبلی نے اپنے گراں قدر مقالے "اقبال اور غزالی" میں رقم طراز ہیں۔

"طاقت اور سخت کوشی کے تصور کو اقبال کے نظامِ فکر میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تسخیرِ کائنات انسان کے مقاصد میں شامل ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اس مقصد کے حصول کے لیے طاقت بھی فراہم کرے۔ علامہ اقبال طاقت کو صداقت سے زیادہ الوہی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب طاقت کے بغیر محض فلسفہ ہے اور عصا کے بغیر کلیمی کارِ بے بنیاد ہے"۔(۱۰)

مذہبی عقاید و افکار کی ترویج و اشاعت میں مزاحم قوتوں سے بارہا مسابقت و محاربت کے مراحل درپیش آسکتے ہیں۔ اسی بنا پر اقبال اپنی قوم کے ہر فرد میں صفاتِ کلیمی اور خصائص شاہینی دیکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ صفات و خصائص تساہل و تعیش اور عافیت کوشی و آرام طلبی کے مشاغل سے حاصل نہیں ہوتے۔ قطرے سے گہر ہونے کی منازل بڑی کٹھن ہیں۔ بانگِ درا کے تیسرے دور کی ایک نظم "ارتقا" میں اقبال کے فلسفہ سخت کوشی یا Philosophy of Vigour، کی وضاحت بڑی جامعیت سے ملتی ہے۔

سیتزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور وشور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشا کشِ رزم و گرما، تپ و تراش و خراش
زخاک تیرہ دروں تابہ شیشۂ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید
مقامِ قطرۂ نیساں و آتشِ غضبی
اسی کشا کشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملتِ عربی(۱۱)

اقبال شخصیت کے مخفی جوہروں کو نکھارنے کے لیے فرد و قوم میں سخت کوشی کے اوصاف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سخت کوشی کے مقامات و مراحلِ جانکاہ سے گزرنے کے بعد وہ فرد و قوم خطر طلب اور خطر پسند بھی دیکھنا چاہتے کیونکہ خطر طلبی اور خطر پسندی اس منفی قسم کے خوف و ہراس سے پیدا ہوتی ہے جو نحیف و ناتواں قوموں کا حیلہ و ہتھیار ہے۔ لیکن اقبال ضعف و ناتوانی کے اس ہتھیار کو عصائے کلیمی سے بدلنا چاہتے ہیں اور فرد و قوم کو قوت ید الٰہی کی رمزیں سکھانا چاہتے ہیں ان میں حضرتِ ابراہیم کی وہ جرات رندانہ اور خطر طلبی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو آگ کو گلزار بنانے کی صلاحیت پر قادر ہے۔ خطر طلبی و خطر پسندی ان اشعار کے مافی الضمیر میں دیکھیے۔

آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب
از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگ آسود از درِ بتخانہ خواہ
نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ

اقبال کے نزدیک خطر پسندی بھی قوت اور صلابت و جزالت کے مظاہر میں ہے۔ اس لیے یہ خطر پسندی زندگی کی آبرو بڑھاتی ہے اور خدا کے اس کائناتی منصوبہ میں تسخیر و ارتقا کے عمل کو جاری رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اقبال کا فلسفہ سخت کوشی و خطر پسندی قوت و توانائی کے جن علائم کی وساطت سے ظاہر ہوا ہے ان میں کلیم، اور شاہین کو ایک مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ بالِ جبریل کی ایک نظم، شاہیں، میں کہتے ہیں:

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اقبال کا شاہین جو مسلمان نوجوان کی ذات کا استعارہ ہے جو طبعاً جنگجویانہ خصائص بھی رکھتا ہے اور بیاباں کی وسعتوں میں پلٹنے اور جھپٹنے کے عمل سے اپنی خطر پسندی کا ثبوت بھی دیتا ہے۔ نیلگوں آسماں کی بیکراں وسعتیں اس کی تگ و تاز کا میدان ہیں۔ اقبال کو صحرائی اور بدوی تہذیب کے اجزا اس لیے مرغوب ہیں کہ یہ انسان کے فطری جوہروں کو نکھارنے اور اسے مستعد و فعال بنانے کے لیے ایک کارگہہ عمل مہیا کرتے ہیں۔ اسے شکارِ زندہ کی لذت سے بہرہ یاب ہونے کا ذوق دیتے ہیں۔ اس لیے کہ:

"ضعیفی کسی سطح پر ہو، نفسی یا حیاتیاتی اقبال کے لیے قابلِ قبول نہیں اس لیے کہ یہ امتِ مسلمہ کے وجود کو ختم کرنے والی ہے۔ امر بالمعروف کا مطلب باطل کی قوتوں کو چیلنج کرنا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان میں ایسا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اور پھر دوسری سطح یعنی نہی عن المنکر کا تو قوت کے بغیر ظہور کرنا بھی محال ہے۔ چنانچہ بدی کو مٹانے اور حق کو برپا کرنے کے لیے توانائی ایک ناگزیر عنصر ہے"۔ (۱۲)

اقبال کے نظامِ افکار میں حرکت، تغیر اور توانائی کے مظاہر کی اتنی افراط ہے کہ جس سے بلاشبہ فرد و قوم کے ذوقِ خطر پسندی کی ہر انداز سے تسکین ہو سکتی ہے۔ ذہنی، حیاتیاتی اور ہر نوع کی طاقت و جبروت کے عملی مظاہرے اقبال کو بہت مرغوب ہیں۔ شاہین کی علامت ان کے فلسفۂ سخت کوشی، ذوقِ محاربت اور خطر پسندی کی ایک بڑی جامع علامت ہے۔

"علامہ اقبال نے ہمیشہ ریگستانی و کوہستانی زندگی کا طریق پسند کیا۔ کیونکہ اس سے جوہر مردانگی پروش پاتا ہے۔ جبکہ آسودہ حالی اور مادی زندگی کی مشینی سہولتیں انسان کو تساہل پسند بنادیتی ہیں۔ تاریخ اسلام کا بھی ایک سبق یہ ہے کہ جب تک مسلمان محلاتی زندگی سے دور رہے۔ خاک نشینی اور مشکل پسندی پر کار بند رہے۔ انھوں نے تسخیر کائنات کے عظیم کارنامے سر انجام دیے۔ سمندر، پہاڑ، بھوک اور پیاس، خوف و خطر اور بے سروسامانی ان کی اخلاقی و مادی فتوحات کے راستے میں حائل نہ ہوسکیں"۔ (۱۳)

محاربت اور ریاضت کے مظاہروں کو استحسان کی نظر سے دیکھنا اور شکوہ و جبروت کو ارتقاء کا ایک لازمی عنصر سمجھنا صرف اقبال کے نظامِ افکار سے ہی مخصوص نہیں۔ فرانس کے مشہور فلاسفر برگسان جنھیں اقبال کا ہم عصر ہونے کا اعزاز حاصل ہے کہتے ہیں:

"Life is one great force, one vast vital impulse, given once for all from the begining of the world meeting the resistance of matter, struggling to break a way through matter"(14)

اقبال اسی مادی کائنات کے عملِ تسخیر میں برگسان سے بھی کہیں بڑھ کر بڑی جانفشانی اور مستعدی سے اپنی ہر مخفی اور ظاہری صلاحیت کو زیر استعمال لانا چاہتے ہیں۔ وہ جُہد ریاضت کے اس سفر میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہیں۔ وہ ہر ذرے کے دل میں اپنی بلند ہمتی، سخت کوشی اور محاربت کا نقش ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی خطر پسند طبیعت کی تسکین کے دُنیا میں ہنگامِ رُستاخیز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سخت کوشی کے اسی فلسفے کے تحت وہ اپنی غزل میں بیماریٔ نغمہ عاشقانہ سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ وہ جب مولاناروم کی اس زمین میں غزل کہتے ہیں۔

بنمائے رُخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
بگشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزوست

تواپنے مزاج کی آن بان ٹھوبُو اور خطر پسندی کے تحت کہتے ہیں:

تیروسنانِ و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میاکہ مسلکِ شبیرم آرزوست(۱۵)

کچھ مزید اشعار میں ان کے جنگجویانہ تیور اور ذوقِ نبلاد دیکھیے:

زقید وصید نہنگان حکایتے آور
مگو کہ ذورقِ ما روشناسِ دریانیست(۱۶)

زبورِ عجم میں ایک جگہ کہتے ہیں:

بقصدِ صید پلنگ از چمن سرابر خیز
بکوہ رخت کشا خیمہ دربیاباں کش(۱۷)

غزل کے یہ شعر تو ان کے ذوقِ محاربت اور خطر پسندی کی انتہا کے حامل ہیں۔

عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را
جام جہاں نُما مجو، دستِ جہاں گشا طلب

راہ رواں برہنہ پا، راہ تمام خار زار
تا بہ مقامِ خود رسی راحلہ از رضا طلب(۱۸)

وہ قوم کے ہر فرد کو ہمیشہ جدوجہد کرنے والے امانِ سخت کوشش میں بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ شیوہ حیدری اور صلاحیت کراری پیدا کرکے انھیں خارا شگاف اور خیبر شکن بنانا چاہتے ہیں۔ پیامِ مشرق میں ان کی نظم "شاہین وماہی" ان کے فلسفہ سخت کوشی اور خطر پسندی کی ایک بھرپور تمثیل ہے۔ اقبال نے اپنے مذکور فلسفے کے اظہار کے لیے ہر طرح کے شاعرانہ حربے (Poetic tactics) استعمال کیے ہیں۔ پیام مشرق ہی میں ان کی ایک اور نظم "اگر خواہی حیاتِ اندر خطر زی" ہے جو دو ہر نوں کے باہمی مکالمے پر مشتمل ہے۔ اس کا آخری شعر ہے:

خطر تاب و تواں را امتحاں است
عیارِ ممکنات جسم و جاں است(۱۹)

خطر پسندی اقبال کے نزدیک ہر فرد کے جسم و جاں کے امکانات اور صلاحیتوں کی کسوٹی ہے۔ خطر پسندی اور سخت کوشی کے اس ترازو پر اپنے وجودِ معنوی کے امکانات کو تول کر فرد محض اپنے ذوقِ استیلا اور طاقت کا ہی مظاہرہ نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی قوم کے لیے تسخیرِ کائنات اور حفظِ وجود کے مراحل کو بھی آسان کر دیتا ہے۔

اقبال کے جذبۂ محاربت، فلسفہ سخت کوشی اور خطر پسندی میں قوت و شکوہ کے عناصر کی غلط تاویلات و توضیحات سے "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا" کی صورت حال پیدا کر دی گئی۔ مشرق و مغرب کے مفکرین اور زعما نے اقبال کے شہرہ آفاق فلسفہ خودی میں مراحل سخت کوشی و خطر پسندی کو صحیح تناظر Perspective میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی پروفیسر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور اسے اپنے دیباچے کے ساتھ طبع کرایا تو مغرب کے علمی اور ادبی حلقوں میں جہاں اس کو سراہا گیا۔ وہاں اس پر تنقید بھی ہوئی۔ جہاں ہربرٹ ریڈ نے اقبال کی مثنویات کو جی بھر کر سراہا۔ وہیں پروفیسر ڈکنسن نے اقبال کے نظام افکار میں سخت کوشی اور خطر پسندی اور قوت و جبروت کے عناصر پر بہت سے اعتراضات وارد کیے۔ جو انگلستان میں چھپنے والے ایک انگریزی جریدہ "دی ایسٹمس" میں شائع ہوئے۔ ان اعتراضات و الزامات کی تردید و وضاحت میں اقبال نے ایک طویل مراسلہ ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھا جو فلسفہ سخت کوشی کے اہم امور کی وضاحت و صراحت پر مشتمل ہے۔ اور "اقبالنامہ" کے حصہ اول کے آخر میں ایک طویل ترین خط کی حیثیت سے شامل ہے۔ جو کم و بیش اٹھارہ صفحات پر محیط ہے۔ یہ مثنوی "اسرارِ خودی" کے مباحث پر ڈکنسن کے اعتراضات کا جواب ہے۔ لیکن ہمارا انتہا و مقصود خط کے انھیں حصوں کا جائزہ لیتا ہے۔ جس میں اقبال نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ جو ان کے فلسفہ سخت کوشی، خطر پسندی اور استعدادِ قوت کی تلقینات پر ہوئے ہیں۔ "اقبالنامہ" میں شامل اس وضاحتی خط میں کہتے ہیں:

"مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے مال قرار دیا ہے (انھوں نے مجھے ایک مکتوب لکھا ہے جس میں یہی خیال ظاہر کیا ہے) انھیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں۔ لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک

قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو"۔(۲۰)

اس اعتراض کی روشنی میں بھی اقبال کے ذوق محاربت اور خطر پسندی کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس لیے کہ بین اعلیٰ اخلاقیات کا کوئی بھی منشور خواہ وہ لیگ آف نیشنز کی شکل میں ہو یا "اقوام متحدہ" شکل میں یا قیام امن کے لیے منعقد کی جانے والی کانفرنسیں ہوں۔ نزاعات و اختلافات کی اس دنیا میں اقوام کے مابین تہذیبی، سماجی اور نظریاتی طور پر امن کے قیام کا باعث نہیں بن سکتیں۔ تسخیر کائنات اور تاریخی تسلسل کے رواں دھاروں میں جنگ کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ناممکن ہے۔

اقبال اسی خط میں مسٹر ڈکنسن کی طرف سے ایک اور اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

"مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ سخت کوشی کا ذکر کیا ہے دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علود ارتقا کے لیے تصادم نہایت ضروری ہے۔ میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گراں مایہ ہے۔ جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی صورواشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے۔ ضروری سمجھتا ہوں میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں"۔(۲۱)

اقبال کا فلسفہ سخت کوشیِ کائنات کے قانونِ ارتقا کے تابع ہے وہ قوت و طاقت اور سخت کوشی سے پیکار حیات میں ایک فعال شعر کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

لندن کے علمی حلقوں کی طرف سے "دی ایسٹھنم" کے علاوہ ٹائمز (لبرٹری سپلیمنٹ) میں بھی اقبال پر اعتراضات وارد کیے گئے۔ اقبال کا مذکورہ خط جو ڈاکٹر نکلسن کے نام انھوں نے لکھا لندن کے اخبار (QUEST) میں شائع ہوا تھا۔ پروفیسر ڈکنسن کے "دی ایسٹھنم" کے لٹریری سپلیمنٹ میں چھپنے والے اعتراضات بعد ازاں رسالہ، معارف، کی ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوئے۔ یہ خط اقبال نے اولاً انگریزی میں لکھا معارف میں اس کا اُردو ترجمہ شائع ہوا۔

اقبال کے مغربی معترضین میں Wilfred can twell Smith کا نام بھی آتا ہے۔ جنھوں نے اپنی کتاب Modern Islam in India میں اقبال کی فکر اسلامی اور فلسفیانہ خیالات کی قوت پرستانہ جہت پر تنقید کی ہے۔ آلِ احمد سرور اپنے ایک مضمون "اقبال اور اس کے نکتہ چیں" میں لکھتے ہیں۔

"سمتھ کا خیال یہ ہے کہ اقبال فرد کے متعلق تو اچھی سوچ لیتے ہیں لیکن اجتماعی مسائل کے سمجھنے میں ان سے لغزش ہوتی ہے۔ ان کے یہاں جابجا ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے فسطائیت کی طرف میلان ٹپکتا ہے۔ انسانیت کے لیے ان کا جو پیغام خاص ہے۔ اس میں عورتیں شریک نہیں ہو سکتیں وہ آزادی نسواں کو زمرد کے گلوبند کے مقابلے میں کمتر سمجھتے ہیں"۔(۲۲)

سمتھ صاحب یوں تو اقبال کے مرتبہ دان اور مرتبہ شناس ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک اقبال کے جارحیت پسندانہ میلانات قابل گرفت ہیں یہ اعتراض اقبال کے فلسفے پر وہی کر سکتا ہے جس نے اقبال کے نظام فلسفہ کو بطور ایک فکری اکائی کے دیکھنے کی بجائے اس کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے دیکھا ہو۔ جارحیت ان کے نظام افکار میں ارتقاو تسخیر کے راستوں میں ایک دفاعی ہتھیار بھی ہے اور حکمتِ عملی پر مبنی حربہ یعنی Strategical tactic بھی یہ کوئی انسانی نسل کی غارت گری اور قتلِ عام کا مقصود بالذات منصوبہ نہیں ہے۔

اسی طرح ان کے معترضین میں پروفیسر اے آر گب کا نام بھی آتا ہے۔ اس ضمن میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی لکھتے ہیں۔

"آکسفورڈ یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر اے آر گب نے اپنی کتاب "اسلام میں جدید رجحانات میں اقبال کے فلسفہ اور ان کے اسلامی خیالات پر نکتہ چینیاں کی ہیں اور ان کے فلسفیانہ افکار کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے"۔ (۲۳)

ان نکتہ چینیوں میں اسلام کے فروغ میں شکوہ و جبروت کے عناصر کی بحالی کی ضرورت پر اقبال کے افکار کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے اور اس میں معترض کا متعصبانہ مسیحی ذہن کام کر رہا ہے۔

اقبال کے حلقہ معترضین میں ڈاکٹر سنہا کا نام بھی آتا ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی لکھتے ہیں:

"اس سلسلے میں بہار کے ایک مشہور ہندو لیڈر اور اہلِ قلم ڈاکٹر سچدانند سنہا آنجہانی نے اقبال کی شاعری اور پیغام پر پانچ سو صفحوں کی ایک ضخیم کتاب Iablal his poetry and massage لکھی ہے۔ جو اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے"۔ (۲۴)

اس کتاب میں اقبال کو ایک متعصب مسلمان اور قوم پرست ثابت کیا گیا ہے۔ جو ریاضت اور سخت کوشی کی تعلیمات سے اور طاقت و قوت کے فلسفے کی مدد سے مسلمانوں کو پوری دنیا پر تسلط اور اقتدار کے خواب دکھا رہا ہے۔

اس اعتراض میں بھی ایک کم نظر ہندو کی فرقہ وارانہ اور مخاصمانہ ذہنیت کام کر رہی ہے۔ جو اقبال کے فلسفے کے شکوہ و جبروت سے اپنی نفسیاتی پیچیدگی اور کمزوری کی وجہ سے خائف ہے۔

اقبال کے معترضین میں کچھ ترقی پسند زعمائے ادب کے نام بھی آتے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری نے اپنے ترقی پسندانہ منشور کے پیمانۂ انتقاد کی [illegible] پر اقبال کی فکرِ فلک رس اور آفاقی نکتہ نظر کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اختر حسین رائے پوری اپنی کتاب "ادب اور انقلاب" میں لکھتے ہیں:

"اقبال قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح سولینی اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی۔ فاشسٹوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے فاشزم کا ہمنوا ہو کر وہ اشتراکیت اور جمہوریت دونوں کی مخالفت کرتا ہے اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاشسٹ میں دیکھ کر وہ جوش میں کہتا ہے۔"

رومۃ الکبریٰ دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں ہیں تیرے سوزِ آرزو سے سینہ تاب

مختصر یہ کہ اقبال اسلامی فاشسٹ ہے"۔ (۲۵)

اس اعتراض کے جواب میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتدال پسندانہ ذہن کی منطقی توجیہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

"اقبال نے ایک خاص ضمن میں مسولینی وغیرہ کی جو تحسین کی ہے۔ اس کی بنا پر انھیں جنگجو اور استبداد پسند کہنا بالکل بے محل ہے۔ وہ جرم ضعیفی کے مخالف ہیں مگر جرمِ استبداد کے بھی مخالف ہیں۔ ان کے کامل نمونے حضرت عمر اور حضرت علی بھی ہیں۔ اور حضرتِ بوذر اور سلمان فارسی بھی بہر حال اقبال کا تصور پیکار اور تصورِ قوت خالص دینی اور اخلاقی ہے اور اس کا مغرب کے غیر اخلاقی تصورات سے کوئی تعلق نہیں"۔(۲۶)

"ادب اور انقلاب" میں اختر حسین رائے پوری کی طرف سے اقبال پر وارد کیا گیا اعتراض ناقدانہ ژرف نگاہی اور تنقیدی سوجھ بوجھ کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ ترقی پسندی کے Newly acquired status کی ہوا میں انھوں نے فکرِ اقبال کی گہرائی اور عمق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یا پھر ان کی سوچ کی تنگ دامانی فکرِ اقبال کی بسیط جہتوں کا احاطہ نہیں کر سکی۔

اقبال نے اپنے ذوق محاربت اور خطر پسندی کو جن علامات و اصطلاحات کے وسیلے سے پیش کیا ہے ان پر بھی ترقی پسندوں کی جانب سے اعتراضات وارد کیے گئے۔ احمد صدیق مجنوں گورکھ پوری اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں:

"جس طرح اقبال کے تصور میں حجاز نے اپنا تسلط جمالیا تھا۔ اسی طرح عقاب، شاہین، شہباز، اور جیسے جیسے سفاک جانوروں نے بھی ان کی فکر و بصیرت میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی وہ انسان میں بالخصوص مردِ مومن میں انھیں پھر بھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں"۔(۲۷)

اقبال پر عقابیت اور فاشیت کا یہ اعتراض اپنی نوعیت کے اعتبار سے سخت ترین اعتراض ہے۔ تحسین فراقی اپنے ایک مقالے "جلوہ خوں گشت و نگاہے بتماشا نرسید" میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"جو شخص امتیاز رنگ و خوں سے بالاتر ہونے کا سبق دیتا ہے اور جس کے یہاں عقاب تمثیل ہے، ترغیب نہیں ہے، اس علاقہ پرستی اور عقابیت کا طعنہ دینا مجنوں صاحب کا ہی حوصلہ ہے۔ انھیں اصل رنج اس بات کا ہے کہ اقبال ترقی پسند کیوں نہ ہوئے اور انھوں نے کریملن کے سایۂ دیوار میں پناہ کیوں نہ لی"۔(۲۸)

میرا خیال ہے علامہ اقبال جیسے نابغۂ روزگار کے دقیق اور گراں مایہ فلسفے پر اس قسم، کے اعتراضات کو Road side intelectualism کا مظاہرہ تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض کسی طرح بھی تنقید کے صائب اور متوازن انداز کے غماز نہیں۔

کتابیات:

آل احمد سرور، نئے اور پرانے چراغ، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ سن ندارد

احمد میاں اختر جونا گڑھی، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، کراچی اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۶۵ء

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر "ادب و انقلاب" بمبئی اپالو بندر، نیشنل ہاوس دوسرا ایڈیشن سن ندارد

عبدالحکیم خلیفہ ڈاکٹر، فکر اقبال، لاہور بزم اقبال، ۱۹۶۸ء

عبداللہ سید ڈاکٹر "مسائلِ اقبال" مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۷۴ء

عبدالواحد معینی سید، ڈاکٹر مقالاتِ اقبال لاہور آئینہ ادب ۱۹۸۸ء

عطااللہ شیخ مرتب، اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال لاہور شیخ محمد اشرف سن ندارد
مبارک علی ڈاکٹر تاریخ کے نظریات، لاہور نگارشات سن ندارد
مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، کراچی مکتبہ دانیال ۱۹۸۵ء
محمد اقبال اسارو رموز، لاہور، غلام علی پرنٹرز ۱۹۹۰ء
محمد اقبال، بانگِ درا، لاہور غلام علی پرنٹرز ۱۹۷۴ء
محمد اقبال پیام مشرق لاہور غلام علی پرنٹرز ۱۹۸۹ء
محمد اقبال، زبورِ عجم، لاہور پاکستان ٹائم پریس سن ندارد
محمد ایوب شاہد، اقبال کا تصور توانائی، سرگودھا المدینہ پبلشرز سن ندارد
وحید عشرت ڈاکٹر مرتب اقبال ۸۴ء لاہور، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۶ء

ENGLISH BOOKS
BERTRANI RUSSELL, "HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY" LONDON ROUTLEDGE 1991

رسائل

مقالاتِ اقبال، عالمی کانگریس منعقدہ ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء
جام نو اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

حواشی:

(۱) عبدالواحد معینی سید، مرتب، مقالاتِ اقبال، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۸۸ء ص ۲۰۷
(۲) محمد اقبال، اسرار درموز، لاہور، غلام علی پرنٹرز ۱۹۹۰ء ص ۱۷
(۳) محمد اقبال، اسرار ورموز ۱۹۹۰ء ص ۱۸
(۴) محمد اقبال، اسرار ورموز ۱۹۹۰ء ص ۴۱
(۵) محمد اقبال، اسرار ورموز ۱۹۹۰ء ص ۴۵-۴۶
(۶) مبارک علی ڈاکٹر، تاریخ کے نظریات، لاہور، نگارشات س ندارد ص ۹۳
(۷) محمد اقبال، اسرار ورموز ۱۹۹۰ء، ص ۵۰
(۸) مجنوں، گورکھپوری، ادب اور زندگی، کراچی، مکتبہ دانیال ۱۹۸۵ء ص ۲۱۱
(۹) عبدالحکیم خلیفہ، ڈاکٹر فکر اقبال، لاہور، بزم اقبال ۱۹۶۸ ص ۲۴۱
(۱۰) محمد اقبال، اسرار ورموز ۱۹۹۰ء، ص ۵۷
(۱۱) BERTRAND RUSSELL, HISTORY OF WE STERN PHILOSOPHY, LONDON, ROUTLEDGE, 1991,PG 738
(۱۲) مشمولہ "مقالات اقبال عالمی کانگریس منعقدہ ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء، لاہور دانش گاہ پنجاب ص ۱۵۱
(۱۳) محمد اقبال، بانگ درا، لاہور، غلام علی پبلشرز، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲۳

(۱۴) محمد ایوب شاہد، اقبال کا تصورِ توانائی، سرگودھا المدینہ پبلشرز، سن ندارد ص ۱۱۰-۱۱۱
(۱۵) وحید عشرت ڈاکٹر، مرتب، اقبال ۸۴، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء ص ۴۷۴ (مقالہ "اقبال کا تصورِ فقر" از ڈاکٹر صفدر محمود
(۱۶) RUSSELL, BERTRAND, HISTORY OF PHILOSOPHY, P 757
(۱۷) محمد اقبال، پیامِ مشرق، لاہور، غلام علی پرنٹرز، ۱۹۸۹ء ص ۱۵۶
(۱۸) محمد اقبال، پیامِ مشرق، ص ۱۵۹
(۱۹) محمد اقبال، زبورِ عجم، پاکستان ٹائم پریس، لاہور، سن ندارد ص ۱۰۲
(۲۰) محمد اقبال، زبورِ عجم، ص ۱۶۳
(۲۱) محمد اقبال، پیامِ مشرق ص ۱۲۳
(۲۲) عطاء اللہ شیخ، مرتب، اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، لاہور، شیخ محمد اشرف سن ندارد ص ۴۶۰-۴۶۱
(۲۳) عطاء اللہ شیخ، اقبالنامہ، ص ۴۶۴-۴۶۵
(۲۴) آلِ احمد سرور، نئے اور پرانے چراغ، ایجوکیشنل ہاؤس، علی گڑھ سن ندارد
(۲۵) احمد میاں اختر، قاضی، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، کراچی اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۶۵ء ص ۱۵۵
(۲۶) کتاب مذکور ص ۱۵۶
(۲۷) اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر ادب و انقلاب، بمبئی، اپالو بندر، نیشنل ہاؤس دوسرا ایڈیشن سن ندارد ص ۵۹ تا ۶۲
(۲۸) عبداللہ سید ڈاکٹر، مسائلِ اقبال، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ۱۹۷۴ء ص ۳۴۱
(۲۹) متمولہ، جام نواقبال نمبر ص ۱۳۸
(۳۰) وحید عشرت، ڈاکٹر، مرتب اقبال ۸۴ء لاہور، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۶ء ص ۴۲۳

قدیم شعرا، محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور تعارف

غزل نما

جس کو محترمہ ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور مطالعے کے بعد ترتیب دیا
طلبہ اور ریسرچ اسکالر دونوں اس سے مستفید ہو سکتے ہیں

قیمت:=/۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

اقبال بحیثیت متکلمِ جدید

زاہدہ پروین

"علم الکلام اسلام کے دینی علوم میں سے ایک علم ہے جس کا مقصد عقائد دینیہ کو دلائل عقلیہ کے ذریعے پایہ ثبوت تک پہنچانا اور مخالفین کے شکوک و شبہات کا دور کرنا ہے"۔(۱)

گویا علم الکلام عقائد دینیہ کے اثبات کے لیے دلائل مہیا کرنے کی خدمت بجا لاتا ہے اور یوں ایمانیات کا دفاع کرتا ہے اور اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے دینی عقائد کے بارے میں شک کرنے والوں اور منکروں کے خلاف قدم اٹھاتا ہے۔ "علم کلام صحیح معنوں میں ایک اسلامی علم ہے اس نے اپنے آپ کو مسلم دینی معاشرے تک محدود رکھا اور وہ عیسائی اور یہودی الہیات سے قطعاً الگ تھلگ رہا جو بالکل اس جیسے ثقافتی پس منظر میں منصہ شہود پر آئی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ Scholasticims کا ترجمہ علم الکلام کرنا صحیح نہیں سمجھا جاتا علم کلام کو فلسفہ یا حکمت کہنا بھی درست نہیں کیونکہ یہ خالص دینی اسلامی علم ہے جبکہ حکمت میں مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی حصہ لیا۔ اسلامی علم کلام صرف مسلمانوں نے پیدا کیا"۔(۲)

دینی علوم پر خامہ فرسائی برِصغیر پاک و ہند کے مسلم علما کا بھی خاص موضوع رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر، حدیث، فقہ و تصوف کے علاوہ علم الکلام پر بھی یہاں کے علماَ نے کثیر تعداد میں تصانیف پیش کی ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتابیں نہ صرف اسلامی ہند کی سرگرم دینی زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک لازمی پس منظر کا کام دیتی ہیں بلکہ ان کے اثرات بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر باقی اسلامی دنیا پر بھی محسوس کئے گئے ہیں چنانچہ ان کے مصنفین کے نام آج بھی اسلامی ممالک میں عزت و احترام سے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان مصنفین کے جذباتی مافیہ میں اسلامی معاشرے کے لیے حیات نو اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بہت بڑی خواہش شامل رہی ہے۔ اسلم انصاری صاحب نے گزشتہ پانچ سو سالوں میں منظر عام پر آنے والی اسلامی فکر کی حامل تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے جن تین تصنیفات کو اسلامی فکر کے روشن ترین نقطے اور فکر تازہ کے آفتاب و ماہتاب قرار دیا ہے ان میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ اور علامہ اقبال کے خطبات یعنی تشکیل جدید الہیات اسلامیہ شامل ہیں:

> "ان تینوں نقاط میں ہمیں اسلامی فکر کی ربط اور تشکیلِ نو کا ایک عمل واضح طور پر دکھائی دیتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اسلامی فکر کی تاریخ میں انہیں ایک ناقابلِ فراموش اجتماعی واردات (collective experience) کی حیثیت عطا کرتی ہے"۔(۳)

اقبال اگرچہ ایک عظیم شاعر ہیں لیکن ان کی نظم و نثر کے دامن میں جو افکار و نظریات نظر آتے ہیں ان کے باوصف ہم اقبال کو ایک متکلم کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔ سید علی عباس جلالپوری نے متکلم کی تعریف کے سلسلے میں ایک عیسائی متکلم انسلم کا قول نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے:

"میں پہلے عقیدہ رکھتا ہوں پھر غور و فکر کرتا ہوں، غور و فکر کے بعد عقیدہ اختیار نہیں کرتا"۔(۴)

گویا علم کلام پہلے عقیدہ رکھنا اور پھر غور و فکر کرنا ہے اور جو شخص آزادانہ غور و فکر کے بعد کوئی عقیدہ اختیار کرے گا وہ متکلم نہیں رہے گا۔ فلسفی کہلائے گا۔ اقبال کے سلسلے میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اقبال نے غور و فکر کے بعد عقیدہ اختیار نہیں کیا کیونکہ عقیدہ تو انہیں وراثت میں ملا تھا بلکہ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

"غذائے روح اقبال کو شروع ہی سے جسمانی رزق کے ساتھ باپ سے ملتی رہی۔ اقبال آخر عمر میں کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنا زاویہ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ نگاہ ورثہ میں مل گیا تھا"۔(۵)

اقبال اپنی ذہنی بصیرت اور روحانی و مذہبی عقائد کے استحکام کے باعث جس دین مستقیم کے شیدا تھے اس کی نشاۃ ثانیہ کے لیے عملی طور پر بھی کوشاں تھے اس لیے کہ وہ روایتی علم کلام کی ضرر رسانی اور بے ثمری سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے جس کا اظہار ان اشعار میں ہوتا ہے:

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم کلام
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(ا-ح)

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
کلام و فلسفہ از لوح دل فرو شستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

(ض-ک)

قرآن کو بازیچہ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

(ب-ج)

بہرحال اقبال نے یہ محسوس کیا کہ:

"آج کی ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کو نئے راستوں کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو بر سر کار لایا جائے"۔(۶)

اقبال نے نہ صرف جدید علمی و سائنسی رجحانات و انکشافات کی روشنی میں الہیات اسلامیہ کو از سرِ نو مرتب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا بلکہ اس کی طرف عملی قدم بھی اٹھایا۔ خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے"۔(۷)

اقبال نے (Reconstruction of Relegious thought in Islam) تشکیلِ جدید الہیات اسلامیہ تصنیف کی جس میں فلسفہ و تصوف، توحید و رسالت، مابعد الطبیعیات، مسئلہ خیر و شر، ارتقاء، مسئلہ جبر و قدر، معیشت و معاشرت، نظریہ خودی، مرد مومن، بعثت، معجزات، دین و سیاست، وطنیت و اتحاد اسلام جیسے افکار کو حسبِ ذیل موضوعات کے تحت پیش کیا۔

علم اور مذہبی الہامات، مذہبی الہامات کا فلسفیانہ معیار، ذات واجب کا تصور اور عبارت کی حقیقت، انانیت انسانی اور مسئلہ جبر و قدر، تمدن اسلامی کی روح، مسئلہ اجتہاد اور مذہب کا امکان۔

یہ سات خطبات لکھ کر ان کے ذریعے دورِ جدید میں اسلام کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے جسے رشید احمد صدیقی نے ہمارے لیے اس صدی کا علم کلام قرار دیا۔(۸)

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے دیباچے میں اقبال تحریر کرتے ہیں:

"میں نے اسلام کی روایات فکر، علیٰ ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں، الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو سر دست ہمارے نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و تفکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستہ کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کئے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکر انسانی کے نشوونما پر باحتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں"۔(۹)

اس آزادانہ اور ناقدانہ رویے کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی نئے نئے علمی انکشافات ہوں تو ان سے ایسے نظریات اخذ نہ کیے جائیں جو مذہبی مسلمات کے منافی ہوں۔ آزادی سے ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علوم جدیدہ کے نتائج و افکار سے کوئی ایسا نظریہ بھی مرتب کیا جاسکتا ہے جو مذہبی عقائد کی نفی و ابطال کا باعث ہو سکے۔ ڈاکٹر عشرت حسین لکھتے ہیں:

iqbal' is in the twentieth century, perhaps by for, the most" consistant attempt to reconcile religion and philosophy in

islam. The great merit of his work is that he has reconstructed religious thought in Islam, and carried out the task which centuries ago our great scholastics like Nzzam and Ashari set to themselves in the face of Greek Science and Philosophy.(10)

میرا خیال ہے کہ اقبال نے خطبات کے ذریعے جو وقیع کام کر دکھایا اور اسلامی تفکر کی تشکیل جدید کا جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے سمجھنے کے لیے خطبات کے مباحث پر ایک نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔

پہلا خطبہ علم بالوحی اور علم بالحواس سے متعلقہ بحث پہ مشتمل ہے یہ لیکچر مذہبیات کے سلسلے میں ابتدائی اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مذہب بالخصوص دین اسلام کی بنیاد اور اس کا ماخذ وحی الٰہی ہے اور اس کے برعکس جتنے علوم و فنون ابتدائے آفرینش سے آج تک مدون و مرتب ہوے ان کا ماخذ فکر انسانی ہے۔ گویا علوم کی دو واضح اقسام ہیں ایک علوم بنوی اور دوسرے علوم عقلی یا دینوی۔ علوم نبوی کا سرچشمہ اعلیٰ ترین وجدان ہے اور علوم دنیاوی کا مبدء فکر انسان۔ اقبال نے اس لیکچر میں فلسفہ جدید کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ وجدان بھی علم کا ایسا ہی یقینی ذریعہ ہے جیسے فکر، بلکہ اس سے کہیں زیادہ واضح، زیادہ بدیہی اور زیادہ موثر۔

دوسرے خطبے کا عنوان ہے مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار۔ اس خطبہ میں اقبال نے یہ بحث کی ہے کہ وجدانی طور پر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عقل و استدلال کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے اس سلسلے میں انھوں نے بتایا ہے کہ وجدانی علم کا مرکزی نقطہ یا منتہا ذات باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات ہے۔ انسانی فکر نے ابتدائے آفرینش سے اب تک جو کچھ تلاش و تحقیق کی ہے اور حیات و کائنات کے متعلق، جو کچھ وسیع ترین استقرا اور عمیق ترین تفحص کیا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جوہرِ وجد میں ایک تخلیقی و تکوینی مشیت ہے جسے نفس یا انائے مطلق کہہ سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پہلے دو خطبات میں بقول اسلم انصاری:

"ان کا زور ان نکات پر ہے کہ جدید تجربی سائنس کا پیش رو اسلام ہی ہے جس نے استقرائی فکر (Induction) کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسرا نکتہ یہ کہ جدید طبیعیات نے کائنات کی مادی تعبیر پر ضرب کاری لگا دی ہے۔ اب مادہ کوئی ایسی حقیقت نہیں رہا جس کے ذریعے مادیین۔ مذہب کی صداقتوں کو فوری طور پر رد کر سکیں"۔(۱۱)

ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا تیسرے خطبے کا موضوع ہے۔ اس خطبے میں اقبال نے ذات باری تعالیٰ کے متعلق اپنے تصورات پیش کیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ذات باری لازمانی و لامکانی ہے اس کی ذات و صفات میں اخلاقی، علم، قدرت کاملہ اور سرمدیت پائی جاتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ خدا کی آنکھ جملہ مرئیات کو دیکھتی ہے اور اس کے کان کا جملہ مسموعات کو سنتے ہیں مگر ایک واحد اور ناقابلِ تجزیہ عمل ادراک کی صورت میں"۔(۱۲)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک خدا کا تصور طبعی بھی ہے اور ماورائی بھی مگر جملہ صورتوں میں لامتناہی بھی اقبال نے اپنی شاعری میں بھی ذات الٰہیہ کی بحث اٹھائی ہے لیکن وہ صوفیا کی طرح ذات الٰہیہ کی انتھک بحث نہیں کرتے البتہ وہ خدائے بزرگ و برتر کی توسیع پذیر تخلیقی قوت کو قرآنی تعلیمات اور کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَانٍ یعنی خدا ہر روز ایک نئی حالت میں ہوتا ہے کہ پیش نظر آئن سٹائن کے منتہی مگر غیر محدود نظریہ کائنات کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

(ب-ج)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

(ض۔ک)

یہاں اقبال اشاعرہ کے "کائنات تکمیل یافتہ ہے" کے تصور کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقبال نے قرآنی اصطلاح نور کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جسے صوفیا نے خدا کے حاضر و ناظر ہونے کی دلیل سمجھا ہے۔ اقبال اسے یوں واضح کرتے ہیں "اگر نور کا اطلاق ذات الہیہ پر کیا جائے تو ہمیں اپنی جدید معلومات کی روشنی میں یہ سمجھنا چاہیے کے اس کا اشارہ ذات الہیہ کی مطلقیت کی طرف ہے ہر کہیں موجودگی کی طرف نہیں"۔(۱۳)

اقبال کے تصور الہیہ کی تشکیل جدید میں سامنے آنے والے نظریات میں اہم نظریہ یہی ہے کہ وہ یونانی فکر کی روشنیوں میں تصور خدا کی تشریح کے خلاف ہیں جس نے خدائے زندہ کو ایک بے حس ہیکل بنا کے رکھ دیا جبکہ اقبال کو اس جمود آموز خدا کے مقابلے میں اسلام کا ذات الہیہ کا محرک نظریہ جس میں خدا رحیم و شفیق ہی نہیں بلکہ قادر مطلق بھی ہے زیادہ متاثر کرتا ہے۔

اس خطبے میں اقبال نے دعا کی حقیقت پر نفسیات جدیدہ کی روشنی میں سیر حاصل بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ جدید انسان کی فطرت میں قدیم انسان ہی کی طرح عجز و نیاز مندی، پناہ جوئی و خود سپردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ انسانی ضمیر و روح کی فطری پکار ہمیشہ سے یہی رہی ہے اور ہمیشہ ہی رہے گی کہ:

ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبیں نیاز میں

(ب۔د)

مختصر یہ کہ اقبال نے اپنے تیسرے خطبے میں خدا کے قرآنی تصور پر توجہ مبذول کروائی ہے اور توحید کا بھرپور پرچار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اقبال نے اپنے اس تصور کی اپنی جملہ تصانیف یعنی اسرار خودی، بانگ درا کی مختلف نظموں مثلاً شمع و شاعر کے ذیل میں جاوید نامہ مثنوی مسافر میں، غرض کئی ایک مقامات پہ وضاحت کی ہے۔ یہ تصور جو وحدت انسانی کا مظہر بھی ہے اور دین اسلام کا بنیادی عنصر بھی اقبال کی شاعری میں مختلف اور متعدد طریقوں کے ساتھ مذکور ہے۔ اقبال اس تصور کو خلاصہ دین اسلام ہی نہیں قوت و عصائے اسلام بھی سمجھتے ہیں:

چو عصائے لا الہ آری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

(ا۔خ)

اقبال کے چوتھے خطبے کا عنوان خودی، جبر و قدر اور حیات بعد الموت ہے۔ اس خطبہ میں علامہ اقبال نے اپنے خاص موضوع خودی کو چھیڑا ہے اور پھر اس خودی کے تعلق سے جبر و قدر پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں "انسانی انا" کی بقا یعنی حیات بعد الموت کے مسئلہ پر بحث کی ہے ان تمام مباحث کا تعلق اسلام کے بنیادی مابعد الطبیعیاتی تصورات سے ہے۔ اس خطبہ کے آغاز میں علامہ اقبال نے یہ بتایا ہے کہ ازروئے قرآن علم کے تین ذرائع ہیں "تاریخ، خارجی فطرت، نفس انسانی" علامہ اقبال "فی انفسکم افلا تبصرون" کے حوالے سے کہتے ہیں کہ خودی بھی قرآن کی رو سے ایک ذریعہ یا ماخذ علم ہے۔ اقبال کے فلسفہ اور علم کلام یعنی دینی افکار کا مرکزی نقطہ ذات خداوندی کی خدائی اور اس کا انسانی خودی پر اثر ہے۔ جو انسانوں میں احساس خودی اور تعین ذات باعث بنتا

ہے۔ یہ مضمون ان کی پہلی مثنوی میں بھی بیان نہیں ہوا وہ ساری عمر اس کے مبلغ رہے اور اقبال کی نثری اور شعری تصنیفات اس تبلیغ کا ذریعہ لہذا وہ اپنی مثنویوں کے ساتھ ساتھ "بانگ درا"، "بال جبریل"، "زبورِ عجم"، "گلشن راز" جدید خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ اور اپنے مکاتیب میں بھی وقتاً فوقتاً اس کی تشریح و توضیح کرتے رہے ہیں:

پیکر ہستی ز آثار خودی است

ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

(ا-خ)

اس خودی کے باوصف اقبال یہ مغرب کی ترقی کا منفی پہلو عیاں ہوا کہ اس تہذیب کو انسان کے مستقبل پر کوئی یقین نہیں جبکہ اسلام کی اصل تعلیم حیات افروز اور یقین و ایمان کی دولت سے مالامال ہے اس سلسلے میں اقبال مولانا روم کی مثنوی کے وہ اشعار بھی نقل کرتے ہیں جو ارتقائے حیات کے مظہر ہیں اور خطبات میں اقبال کا یقین یوں اظہار پاتا ہے:

"بزم ہستی میں ہر کہیں خودی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذات انسانی میں اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا ہے"۔(۱۴)

اقبال کا یہ کہنا کہ "با نور خودی بنید خدارا" ہمیں اس حدیث رسول ﷺ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ تخلقو باخلاق اللہ یعنی اپنے اندر خدائی اخلاق اور صفات پیدا کرو یہی انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا مقصد ہے کہ وہ ذات وحدہ لاشریک سے قریب تر ہو جائے اور اس کی صفات عالیہ کو اپنے اندر پیدا کر کے بقول اقبال مرد مومن یا انسان کامل کا درجہ پالے:

آں مسلمانے کہ بیند خویش را

از جہانے برگزیند خویش را

بندۂ حق وارث پیغمبراں

او نگنجد در جہانِ دیگراں

تا جہانے دیگرے پیدا کند

ایں جہان کہنہ را برہم زند

(مسافر)

اقبال آگے چل کر بتاتے ہیں کہ خودی ہدایتکار ہے اور مقصد کوشش بھی اس لیے وہ مختار ہے مجبور نہیں اور جب بقول اقبال مرد مومن صفات سے متصف ہوتا ہے تو وہ بھی تقدیر بدلنے پر قادر ہو جاتا ہے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(ب-د)

اس خطبہ کے آخر میں اقبال نے حیات بعد الموت پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے حیات بعد الموت ثابت ہے یہ اصل میں ارتقائے خودی کا ایک مرحلہ ہے۔ مرنے کے بعد انسان کا جسم تو فنا ہو جاتا ہے لیکن اس کی خودی

باقی رہتی ہے۔ یہیں اقبال نے جنت و دوزخ پر بھی قرآنی نقطہ نظر سے بحث کی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں خودی کے مختلف احوال کے نام ہیں۔

پانچویں خطبے کا عنوان اسلامی ثقافت کی روح ہے۔ اقبال نے اس خطبے کی ابتدا میں "نبی" اور "ولی" کا فرق واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ولی" اور "نبی" دونوں بقا حق سے بہرہ مند ہوتے ہیں لیکن ولی یا صوفی اپنے آپ کو جلوے کی ایک جھلک میں کھو دیتا ہے اور اپنی ذات کو گم کر دیتا ہے اس کے برعکس نبی حقیقت سرمدی سے اتصال کے بعد بھی اس دنیا میں واپس آتا ہے اس کی یہ "بازآمد" زبردست تخلیقی مقاصد کی حامل ہوتی ہے وہ ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے اور تاریخ کی رو کو اپنی بے پناہ طاقتور خودی کے اثر سے موڑ کر ایک نیا نظام عالم ترتیب دیتا ہے۔ پھر وہ اپنے فیض تعلیم و صحبت سے قدوسیوں کا ایک گروہ منظم کرتا اور ان کو چار دانگ عالم میں پھیلا کر تہذیب و تمدن اور معاشرے کی ایک طرحِ نو کا آغاز کرتا ہے۔ رسالت کی اہمیت کو اقبال نے کچھ اس طرح واضح کیا ہے:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

(ر۔پ)

رموز" بے خودی" کے ان اشعار میں اس بات کی بابت بیان ملتا ہے اقبال کہتے ہیں کہ پیغمبر برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ خطبے میں اقبال نے جہاں یہ بحث اٹھائی کہ وہاں وہ عقلی دلائل کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت ختم ہو گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ اسلام کی ذات گرامی دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ یا نقطہ اتصال کی سی ہے۔ آپ کی ذات میں نبوت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی لہذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔

اقبال نے اسلام میں مرتبہ و مقام نبوت کی اس لطیف توضیح سے ذہن انسانی کی آزادی کا نکتہ اخذ کیا ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ یہی ذہنی آزادی اسلامی ثقافت و تہذیب کی حقیقی روح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقیدہ ختم نبوت کے ساتھ ساتھ اسلام نے آفاق پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ ذہن انسانی کو مطالعہ فطرت اور تسخیر فطرت پر ابھارا۔ اسلام کی پیدا کردہ اس اسپرٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے علم و حکمت کی جستجو کی اور اپنے علمی و سائنسی کارناموں سے تہذیب و تمدن کو چار چاند لگا دیے۔ اس ضمن میں اقبال نے واضح الفاظ میں کہا کہ جدید سائنس اور تسخیر کائنات ہم معنی ہیں اور جدید سائنسی علوم جن کی بنیاد مشاہدہ فطرت استقرائی طرز استدلال اور تجربی طریقہ تحقیق پر ہے قرآنی تعلیمات اور ارشادات نبوی سے ماخوذ ہیں۔ اقبال نے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات کا حوالہ بھی دیا اور کہا کہ یورپی فضلا کا یہ خیال کہ اسلامی تہذیب اور موجودہ تہذیب دونوں کے دونوں یونانی تہذیب کے رہین منت ہیں قطعاً غلط ہے۔ اسلام اور علوم جدیدہ کے عنوان سے ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالے میں بھی اقبال نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا:

"میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ تمام وہ اصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں"۔(۱۵)

اقبال نے کائنات اور بالخصوص زمان و مکاں کے متعلق یونانی نظریات پر تنقید کرتے ہوئے ابوریحان البیرونی کے کائنات کا

حرکی تصور دینے کو یونانی فکر سے انحراف کا نتیجہ بتایا اور چند ایک دیگر مفکرین کے حوالے سے بحث کو آگے بڑھایا۔ اس بحث کے بعد اقبال نے ابنِ خلدون کے نظریہ تاریخ پر مختصراً بحث کی اور بتایا کہ قرآن پاک فلسفہ تاریخ کا سرچشمہ ہے۔ اس خطبے کے آخر میں اقبال نے فلسفہ تاریخ کے مشہور فاضل اسپینگلر کے ان خیالات کی تردید کی جو اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "زوال مغرب" میں اسلامی تہذیب کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ اقبال کی نظر میں وہ عقائد جن سے اسلامی تہذیب کی روح تشکیل پاتی ہے۔ درج ذیل ہیں۔

اللہ کی وحدانیت یا توحید اور رسول ﷺ کی خاتمیت "ان دو عقائد سے جو اجزا ظہور پذیر ہوتے ہیں ان میں ذہن انسانی کی آزادی، فکر انسانی کا مشاہدۂ فطرت کی طرف راغب ہونا اور تسخیر فطرت کا سوچنا وحدت انسانی کو ماننا، تاریخ کو حرکت مسلسل سمجھنا اور انسان کو کائنات وحیات و زمان و مکان کو حرکی تصور کرنا۔

"الاجتہاد فی الاسلام" اقبال کے چھٹے خطبے کا موضوع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی ہئیت اجتماعی میں تغیر و حرکت کا اصل اجتہاد کہلاتا ہے۔ اقبال نے قرآنی آیت "الذین جاہدو فینا لنھد یتھم سبلنا اور آنحضرت ﷺ کی اس حدیث شریف کو (جس میں حضرت معاذ بن جبل نے جو یمن کے گورنر بن کر جارہے تھے، فرمایا تھا کہ معاملات کا فیصلہ اولاً کتاب اللہ اور پھر سنت رسول اللہ ﷺ سے کروں گا اور اگر ان دونوں سے رہنمائی حاصل نہ کر سکا تو پھر اپنی رائے کو کام میں لاؤں گا)۔

اجتہاد کی بنیاد بتایا ہے۔ بعد ازاں اقبال نے تاریخ اسلام میں اجتہاد کو وقتاً فوقتاً بروئے کار لائے جانے اور پھر اجتہاد کی بجائے تقلید کا ذکر کیا ہے اور اسلامی قانون کے چاروں ماخذ قرآن و سنت رسول ﷺ، اجماع اور قیاس کے حوالے سے بتایا ہے کہ اسلامی قانون میں نشوونما کا امکان ہے لہذا مسلمان ہی عہدِ حاضر میں ایسے نظام عالم کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ایسا دستور حیات موجود ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ مسلمان اپنے اس عالمی کردار کو سمجھیں اور "اپنی حیات اجتماعیہ کی از سرِ نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں"۔(۱۶)

ساتواں اور آخری خطبہ جس کا عنوان ہے کیا مذہب کا امکان ہے خالص فلسفیانہ زبان اور انداز بیان کا حامل ہو؟ چونکہ اس کے مخاطب بھی غیر مسلم ہیں یہ گذشتہ چھ خطبات کے سلسلے کی آخری کڑی بھی نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی ایک الگ نوعیت ہے البتہ اس آخری خطبہ کا اپنے ماقبل چھ خطبات سے ایک معنوی ربط ضرور ہے۔

اس خطبہ میں اقبال کہتے ہیں کہ فکر و وجدان دونوں کی کوشش یہ ہے کہ حقیقت کی شہ اور کنہہ تک پہنچیں لیکن فکر کو ابھی تک اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اقبال دور جدید کی فکر یعنی سائنس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے انسان کو اس قابل تو کر دیا کہ وہ فطرت کو مسخر کرلے اور اس پر اپنا تسلط قائم کردے لیکن یہ سب کچھ کس قیمت پر ہوا۔

"مستقبل میں اس کے ایمان اور اعتماد کی دولت کو چھین کر"(۱۷) جدید طبیعیات کے حیرت انگیز انکشافات۔ اور علم کے بدلتے ہوئے تصورات کی روشنی میں اقبال کی یہ اُمید بے جا نہیں کہ اگر سائنسی ترقی کی رفتار یہی رہی تو عنقریب انسانی علوم میں ایک عظیم انقلاب برپا ہونے کا امکان ہے۔ اقبال کو محسوس ہوتا ہے کہ انسانی علم اور انسانی فکر کا یہ متوقع انقلاب انسان کو مذہب اور بالخصوص اسلام سے دور کرنے کی بجائے اس کے قریب لے آئے گا اس لیے کہ اقبال کو جدید مغربی تمدن کی یاس و قنوطیت واضح دکھائی دے رہی ہے اس لیے وہ اپنے خطبے میں مغربی تمدن کے حوالے سے عصر حاضر کے انسان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> "حاصل کلام یہ ہے کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر

ڈالیے تو افراد افراد سے، اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابلِ تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لیے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ در حقیقت زندگی ہی سے اُکتا چکا ہے۔ اس کی نظر حقائق پر ہے یعنی حواس کے اس سرچشمہ پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے لہذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا"۔(۱۸)

فکر کی نارسائی اور ناکامی کے بعد حقیقت کی تہ تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ رہ جاتا ہے جسے "وجدان" کہا جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دور جدید میں وجدان کی توضیح کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں لیکن نفسیات حاضرہ نے مذہبی زندگی یعنی وجدان کا گویا قشر تک نہیں چھوا۔

اقبال نے مشرقی تصوف کے بعض تصورات پہ کڑی تنقید کرنے کے باوجود یہاں مذہب کے علمی جواز کو صوفیا کی واردات میں ہی تلاش کیا ہے اور حضرت شیخ احمد سرہندی کے تنقیدی منہاج تصوف کی تحسین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وجدان کے ان طور طریقوں یا تصوف کے مشاغل کا تجزیہ جس بیباکی اور تنقید و تحقیق سے شیخ احمد سرہندی نے کیا اس سے سلوک و عرفان کا ایک نیا طریق وضع ہوا اور اب دور جدید میں اس نئے طریق کے خطوط سے ملتے جلتے طریقوں کو اپنانا وجدان مشاہدات کے سلسلہ میں زیادہ مفید ہوگا۔

اقبال نے مذہب کے امکان بلکہ ضرورت پہ زور دیتے ہوئے کہا کہ فکر انسانی نے دورِ حاضر کے انسان کو مایوس و دل شکستہ کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس پر علوم جدیدہ کی تشوونما کی بدولت ایک نئی اور عظیم اخلاقی ذمہ داری بھی ڈال دی ہے اس کی اس دل گرفتگی کا مداوا صرف مذہب ہی کر سکتا ہے کہ اس سے اس کے اندر ایمان و یقین کا شعلہ فروزاں ہوگا اور انسان کو اس دور کی نئی اور عظیم ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے کے قابل بنائے گا یہی تو مذہب ہے کیونکہ وہی اس کی پژمردہ اندرونی صلاحیتوں اور افسردہ داخلی قوتوں کو اُبھار سکتا ہے۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے نام سے لکھے گئے خطبات اقبال جن میں اقبال نے اپنی دلچسپیوں کی ترجیحات کا واضح اور صریح ذکر کیا ہے اسلامی فکر کی تاریخ میں ایک سنگ میل یا ایک نئے سرچشمۂ فیضان کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے کہ:

"اسلام کے بنیادی تصورات کی نفسیاتی توضیح، جدید علوم کی روشنی میں قرآن مجید کی تعلیمات کی نئی تعبیرات اور وحی الٰہی کے سلسلے میں مصنف کے ایمان کی پختگی ان خطبات میں بہ خوبی مشہور ہے اور اس لحاظ سے یہ مسلم و غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں جالب توجہ ہیں"۔(۱۹)

اگرچہ اقبال کی شاعری بھی انہی موضوعات کی حامل ہے جن کا ذکر خطبات میں ہوا لیکن خطبات میں چونکہ مربوط فکر کی پیشکش کی گئی ہے لہذا زیادہ سودمند اور کارگر ثابت ہوئی ہے۔ بقول اسلم انصاری "ان خطبات نے احیائے اسلام کی جدید تحریکات کو ایک فکری جہت اور ذہنی ضخامت عطا کی ہے۔ ان خطبات کی خالصتاً فلسفیانہ قدر و قیمت کے باوصف انہیں بجا طور پر عصر حاضر میں ایک نئے علم الکلام کا نقطہ آغاز کہا جاتا ہے"۔(۲۰)

حواشی:

(۱) اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۴/۱ (علم، علما) دانش گاہ پنجاب، ۱۹۸۰ء ص ۷۳/۷۴۱

(۲) ایضاً

(۳) اسلم انصاری، اقبال عہد آفرین، کاروان ادب ملتان ۱۹۸۷ء ص ۱۳۰/۱۳۱
(۴) سید علی عباس جلالپوری، اقبال کا علم کلام، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۷۲ء ص ۱۵
(۵) خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور، ص ۲۳
(۶) اقبال ریویو، اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۳
(۷) بحوالہ، ایس ایم منہاج الدین، افکار و تصورات اقبال، کاروان ادب ملتان ۱۹۸۵ء، ص ۷۹
(۸) سید ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۲۳
(۹) نذیر نیازی سید، مترجم تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۶ء، ۴۰
(۱۰) ایضاً
(۱۱) اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں کاروان ادب ملتان ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۳
(۱۲) نذیر نیازی سید، مترجم، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۵
(۱۳) ایضاً، ص ۹۸
(۱۴) ایضاً، ص ۱۰۹/۱۱۰
(۱۵) سید عبدالواحد، مرتب، مقالات اقبال، آئینہ ادب لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۲۸۱
(۱۶) نذیر نیازی سید، مترجم تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۷/۲۸۸
(۱۷) ایضاً،
(۱۸) ایضاً، ص ۲۸۹/۲۹۰
(۱۹) این میری شمل، پروفیسر ڈاکٹر شہپر جبریل، گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۷۳
(۲۰) اسلم انصاری، اقبال عہد آفرین، کارووان ادب ملتان ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۲

چینی لوک کہانیاں

دوسرا ایڈیشن

شفیع عقیل

صفحات: ۳۲۸

قیمت =/۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

اقبال، اُن کی شاعری اور عہدِ جدید

سیّدہ عُظمیٰ گیلانی

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں برِ صغیر کے مسلمانوں کی بعینہٖ حالت وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، ارادے سقیم ہو چکے تھے۔ ہر شعبۂ زندگی بساطِ بے نظام اور ہر فردِ کارواں ناقۂ بے زمام تھا مبدء فیض کی کرم گستری نے اس قوم کو اقبال جیسا مردِ خود آگاہ و خدا مست عطا کیا جس نے اپنے نفس گدازیوں سے مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر اُن میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیے۔

علامہ اقبال ہمارے ایک ایسے شاعر ہیں جو کائنات، خدا اور بندے کا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی مختلف جہتیں ہیں معاشی، معاشرتی، سیاسی غرض یہ کہ ہر شعبۂ زندگی پر ان کی نگاہ تھی۔ ان کی شاعری کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہیں:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

تقدیروں کے صبح و شام بدلنے کا تصور اقبال نے اپنی نظم "زمانہ" بالِ جبریل میں پیش کیا یہی تصور پیامِ مشرق کی نظم "نوائے وقت" میں بھی ایک خاص تخلیقی جوش اور سرمستی کے عالم میں انھوں نے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے مضمون اقبال کا تصور "زمان و مکاں" میں اس نظم کے حوالے سے بڑی پتے کی بات کہتے ہیں۔ طبیعاتی وقت جو زمان مکان سلسلہ کی ایک سمت ہے اضافی ہے۔ لیکن اصل زمان کو قرآن کریم نے وحدت اور کلیت قرار دے کر تقدیر کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔

تقدیر محض زمان کا نام ہے جبکہ اس کو تواتر کے قید و بند سے آزاد کر دیا جائے تو یہ وقت جو تقدیر ہے حقیقی ہے اور تمام اشیاء کی جان ہے یہ وقت محض یکساں آنات کا اعادہ نہیں ہے بلکہ اس کا لمحہ بالکل جُداگانہ ہے اور اس سے نئی اور انوکھی اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ حقیقت میں موجود رہ کر ہم تسلسلِ وقت کو لمحہ بہ لمحہ تخلیق کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے عصری معاشی مسائل کی گہری سنگینی کے احساس کے تحت اقبال نے ۱۹۰۴ء ہی میں "علم الاقتصاد" کے عنوان سے معاشیات پر ایک کتاب تالیف کی جس سے ان کے گہرے معاشی فہم اور افلاس کے خاتمے کے لیے ان کی دل سوزی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال اسلام کے معاشی تصورات کی تدوین نو کے بھی متمنی تھے اور برِ عظیم کی ملتِ مُسلمہ کو غربت سے نجات دلانے کے لیے بھی بے چین تھے۔

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کررہے ہیں کہ گزشتہ دوسو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی جارہی ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری و سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے اگرچہ ابھی قوی نہیں ہوا، لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت و شدت حاصل کرکے رہے گا"۔

اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں زمانۂ حیات اور کائنات گھل مل کر ایک ہوگئے ہیں۔ وہ کائنات اور انسان کو ایک کلیت میں رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی و روحانی مسائل ایک دوسرے سے مربوط اور منسلک نظر آتے ہیں۔ اپنے عہد کی سیاسی صورتحال کی اصلاح و تہذیب کے باب میں بھی ان کی تجاویز لائقِ تعریف ہیں۔ براِ عظم کے مسلمانوں کے الگ تہذیبی تشخص کا جیسا گہرا شعور اقبال کو تھا ان کے کسی معاصر کو نہ تھا۔ اقبال کے نزدیک عہدِ جدید کا المیہ یہ ہے کہ وہ خودی سے دور اور ذوقِ یقین سے عاری ہوچکا ہے اور ذوقِ جمہور اس کا راہبر ہے:

از خودی دُور اَست و رنجور است و بس
رہبر او ذوقِ جمہور اَست و بس

واقعہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مغربی جمہوریت کی مخالفت کے ضمن میں اقبال کے یہاں شدت پیدا ہوتی گئی اور وہ اس سے مزید بدظن ہوتے گئے چنانچہ "جاوید نامہ" میں انھوں نے یہاں تک کہ دیا کہ:

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے، وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

اقبال بیک وقت براِ عظم کے دلدادہ ملت اسلامیہ کے عاشق اور بنی نوع انسان کے متوالے ہیں۔ تاریخ کے جس موڑ پر ملتِ اسلامیہ کے اس فردِ فرید کا ظہور ہوا اہلِ نظر سے مخفی نہیں بس یہ سمجھیے کہ "ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا کا دلدوز مضمون تھا۔ اقبال لکھتے ہیں کہ:

"قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے، جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے بلکہ اگر اسے اقوامِ عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا منظور ہے تو اپنی آئندہ نسلوں کی بہبود کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریقۂ عمل اختیار کرے جس کے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاف کا تمدن بھی شامل ہو۔ ایک زمانہ تھا جب اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرائی کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقاء ان کے افراد کی تعداد ان کے زورِ بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہر گز اچھے نہیں ہوسکتے"۔(۱) (ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال صفحہ نمبر ۱۸-۶۰)

اقبال نے سیاسی میدان میں دوسروں کو ہٹا کر، گرا کر اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہاں قائدین بہت سے تھے لیکن وہ کسی کو اپنا مدِمقابل اور فریق مخالف نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے بعضوں کی مخالفت بھی کی اور بعضوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ موافقت بھی کی لیکن یہ مخالفت اور موافقت اصلی تھی۔

اس میں رشک و رقابت کے جذبات کو دخل نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں وہ رشک و حسد کے جذبات سے قطعاً مبرا تھے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو سیاسی لیڈر نہیں سمجھتے تھے وہ خود کہتے تھے۔

"میں کسی جماعت کا قائد اور کسی قائد کا پیرو نہیں ہوں"

(محمد احمد خان۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ صفحہ نمبر ۶۹۸)

دماغ فکر سے عاری دل سوز سے خالی نگاہیں بے نور قلوب بے حضور اور قوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہو اور جسے مخالف ہوائیں جدھر جی چاہے اڑائے لیے پھر رہی ہوں۔ حالات تاریخ کے انتہائی سنگین موڑ پر کھڑے ہوں تو قوم کو معاشی، معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں اقبال جیسے مردِ خود آگاہ کے کلام سے استفادہ حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برصغیر کے مسلمانوں میں آزادی کی جنگ کے لیے نئی روح پھونک دی گئی تھی۔

اقبال ایک جدلیاتی مفکر ہیں۔ مادی دنیا کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ وہ انسانی روح اور انسانی ادراک کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ جس کے بغیر دنیا محض بے جان رہ جاتی ہے۔ اس کے ذریعے فی الحقیقت وہ انسان پر دنیا کے نقش کی اہمیت اور یہاں سے حاصل شدہ اس کے ذہنی ادراک پر زور دیتے ہیں، یہ ادراک باطن میں ایک نئی دنیا کی تشکیل کرتا ہے۔ جہاں سے وہ قوت محرکہ جس کا نام "خودی" ہے اور جو ایک اجتماعی چیز ہے۔ اپنے لیے توانائی حاصل کرتی ہے۔

اپنے آپ کو ہر قسم کے بندھن اور استحصال سے آزاد کرنے کی خاطر اقبال ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ انسان کی تخلیقی قوت پر انحصار کیا جائے۔ صرف انسان کی تخلیقی قوت اور قوتِ عمل پر یقین رکھنے سے مسلمان دوبارہ نمو پاسکتے ہیں اور پھول پھل سکتے ہیں۔

خودی اقبال کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرسکتا ہے۔ اقبال اگرچہ فلسفی کے طور پر مادی ہیں لیکن اخلاقی طور پر وہ ایک روحانی اور انسان دوست مفکر ہیں۔ وہ مادی دنیا کی اہمیت پر اصرار کرتے ہیں مگر خود غرضی پر تنقید کرتے ہیں۔ مادی دنیا شر نہیں ہے مگر شر دنیائے مادہ کے ساتھ انسانی رابطے کی نوعیت میں موجود ہوسکتا ہے۔

وہ آدمی جو کام کرتا ہے اور مادی انعام سے بہرہ ور ہوتا ہے کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا لیکن دوسروں کے لیے مادی دنیا کو ممنوع بناتا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کے خرچ پر دولت ذخیرہ کرتا ہے یقیناً گنہگار ہے۔

اقبال کا کارنامہ یہ نہیں کہ انھوں نے غزل کو اپنے مربوط اور شیرازہ بند تصورات، حیات و کائنات اور حیات گریز تصوف کی دھندلی تصویر میں دیکھا بلکہ اقبال نے انھیں فکرِ جدید کی روشنی میں یکسر بدل کر رکھ دیا اور یوں اپنے عہد کے فنکار کے لیے ایک نیا ذہنی پس منظر اور ایک نئی توانا اور مشترک فکری اساس مہیا کی۔

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اقبال کے افکار محض نظری، فلسفیانہ مباحث تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ان کے افکار کا ایک معاشرتی اور عملی پہلو بھی ہے۔ یہ معاشی، معاشرتی اور عملی پہلو ہی ان کے غور و فکر کی اصل غرض و غایت ہے۔ صرف منطقی بحثوں میں الجھے رہنا مقصود نہیں۔ علامہ کے افکار کے اجزاء ان کے اشعار میں بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ان کو یکجا کر کے ایک خاص ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو ایک صاف ستھرے صحت مند، اور برائیوں سے پاک معاشرے کا ڈھانچہ ابھر کر سامنے آتا ہے علامہ کے پیش کردہ نظام حیات عمومی حیثیت سے تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ہے مگر ان کے مخاطب خصوصی طور پر مسلمان ہیں۔ جن کی پسماندگی اور زبوں حالی انھیں خون کے آنسو رُلاتی ہے۔

انھیں اس پسماندگی کا احساس اور شدت سے ہوتا ہے جب وہ تاریخ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت زار کے اسباب پر غور و فکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کی موجودہ حالت زار زبوں حالی اس لیے ہے کہ انھوں نے اس فلسفۂ زندگی کو ترک کر دیا جو ان کے عروج و زوال کا ضامن تھا۔ اور یہ کہ اس قوم کی نشاۃ ثانیہ اس صورت میں ممکن ہے کہ یہ صحیح نظام حیات اختیار کرے۔

اقبال نے ہمیں جو زندگی کا حرکی اور تخلیقی فلسفہ دیا زندگی کے منشات و مقاصد کے عین مطابق ہے اور جو براہِ راست اسلامی فلسفے اور قرآن سے جڑا ہوا ہے۔ اقبال کے بزدیک زندگی ایک نعمت خداوندی ہے۔ اور یہ ہمارے پاس بطور ایک مقدس امانت کے ہے۔ جس کا مقصد شر اور باطل کی قوتوں سے جہاد کرنا اور زمین پر نیابت الٰہی کا حق ادا کرنا ہے۔ ان کے نزدیک یاس، حزن، خوف قاطع حیات ہیں "لاتبت الدھر اور لاتقنطو" اجزائے ایمان ہیں۔ اور زندگی مسلسل آرزومندی اور تمنا آفرینی میں مضمر ہے۔

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو
آتش این فکر از چراغِ آرزو
از تمنائے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس

جس طرح اقبال نے ہمارے نظریۂ زندگی کو نئے معانی دیے۔ اسی طرح انھوں نے ہمارے نظریۂ سیاست و مذہب اور دوسرے تہذیبی رجحانات اور ثقافتی مظاہر کو بھی نئی زندگی دی اور نئے مطالب عطا کیے۔ آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کلام اقبال کا صحیح طور پر مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کے نتائج کو اپنی زندگی اور کردار کا جزو بنالیا جائے۔ کیونکہ آج پھر ہمارے معاشرے میں ایک ہمہ گیر ذہنی اور اخلاقی انحطاط ایک ہمہ جہتی روحانی پستی اور سطحیت نمایاں ہو چکی ہے۔ آج ہمارے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ہم پھر سے کلام اقبال کا مطالعہ کریں اور ایک آزاد قوم کے شایانِ شان اور ایک آزاد عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کریں۔ (۲)

اقبال نے اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں مگر انہیں اپنے ارد گرد بالعموم وہی بوڑھے دکھائی دیے جن میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے اُن کو کچھ دیر سوچنا پڑا کہ اپنے پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برقِ ساماں تھا۔ کیسے پیش کریں مگر تاریخ کے اوراق فلسفے کے غوامض اور انسانی ذہن کے مشاہدات اور قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف نے جلد ہی اُن پر

واضح کردیا کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے۔

اقبال نے یہ بات ثابت کردی کہ ان کا مطالعۂ تاریخ صد فی صد درست تھا۔ لاریب کہ مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کے نازک ترین لمحات میں اسلام ہی ان کے کام آیا۔ اسی نے برصغیر کے منتشر و متفرق مسلمانوں کو ایک قوم بنایا اور اسی نے ان کو ہندو اکثریت کی دائمی غلامی سے نجات دلاکر برصغیر کے ایک حصے میں آزادی و اقتدار کی نعمت سے بہرہ ور کیا۔

ڈاکٹر اقبال کو خاکِ کشمیر سے خاندانی تعلق تھا۔ کیونکہ ان کے بزرگ اسی جنت نظیر کے رہنے والے تھے۔ ویسے خود ڈاکٹر صاحب کو اس خطۂ ارض سے خاص تعلق رہا ہے۔ اُنھوں نے ہی کہا تھا کہ:

تم گِلے از جنتِ کشمیر

ڈاکٹر صاحب نے کشمیر کے مسئلہ کو مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی پیش کیا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں بڑے پُرزور الفاظ میں مسلمانانِ کشمیر کے مطالبات کی تائید کی اور وزیرِ اعظم کشمیر کو توجہ دلائی کہ جلد از جلد وہاں ایک دستوری حکومت قائم کریں۔

آپ نے کہا "جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے میرے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس ملک میں جو واقعات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں ان کا تاریخی پس منظر بیان کروں۔ ایسے لوگوں کی بظاہر یکایک بیداری جن کی خودی کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا ان تمام اشخاص کے لیے جنھیں موجودہ ایشیائی اقوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق اگر بصیرت حاصل ہے مژدۂ جاں فزا ہونا چاہیے۔ کشمیر کے عوام کے مقاصد بالکل درست ہیں اور مجھے اس معاملہ میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کا احساس کا احیانہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہوگا بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لیے ایک ذریعۂ قوت بنے گا۔ (۳)

انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں جاگیرداری سماج ختم ہوکر سرمایہ داری سماج میں تبدیل ہوچکا تھا۔ یہ اس وقت تک انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ اس انقلاب کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہوئی اور انسان فطرت کی غلامی سے آزاد ہوکر فطرت پر حکمرانی کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ آرٹ اور ادب کی نئی تحریکیں، نئی لہریں پیدا ہوئیں۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی نے دنیا کے فاصلوں کو کم کردیا اور ایک دنیا، ایک انسانیت کے تصور نے فروغ پانا شروع کیا۔

اس کے ساتھ سامراجی ملکوں نے پسماندہ ملکوں کے استحصال کے لیے کارٹیل وغیرہ کی شکل میں بین الاقوامی تجارتی ادارے بنانا شروع کیے۔ اور ایک بین الاقوامی استحصالی نظام کی تخلیق کی جس کے مقابلے کے لیے دبے ہوئے طبقوں اور غلام ملکوں نے اپنی آزادی کی تحریک شروع کی اور وہ بین الاقوامی، انسانی تحریک بن گئی۔ اب انقلاب سے مراد وہ تبدیلی ہوئی جو معاشی اور طبقاتی رشتوں کو بدل دے گی۔ یعنی ایک بھرپور معاشی سماجی اور سیاسی تبدیلی جو اشتراکیت کی منزل کی طرف راہنمائی کررہی تھی اور اقبال نے پہلی بار اپنی شاعری میں انقلاب کا لفظ اس تبدیلی کے لیے استعمال کیا۔ یہ لفظ اقبال کے یہاں پہلی بار ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد آیا ہے۔

اقبال نے پیامِ مشرق اور بانگِ درا میں اس لفظ کے استعمال کے بغیر انقلاب کی بشارت دی ہے۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں شائع ہونے والی زبورِ عجم میں صاف صاف کہا ہے۔

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقانان خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچنانِ زہرے کہ ازوے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

با ضعیفاں گاہ نیردے پلنگاں می دہند
شعلۂ شاید بروں آید زفانوس حباب!

انقلاب اے انقلاب

(۴)

اقبال کی آرزو یہی تھی کہ جو پیغامِ انقلاب انگریز قوم کے سامنے پیش کیا جائے وہ نونہالانِ ملت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوجائے تاکہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر اُبلے اور خیابانِ ملت کی طرح سیراب ہوجائے۔ جس سے ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ نظر آنے لگے۔

اقبال نے انسان کو ایک خاص زندگی کا پیغام دیا ہے۔ ان سے بہتر اس چیز کو اور کون جان سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اخلاق کو جو جگہ حاصل ہے وہ ایک ایسی جگہ ہے کہ اس سے بہتر جگہ کسی اور چیز کو میسر آہی نہیں سکتی۔

ہر قوم، ہر مذہب میں ہر زمانے میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ روحانی، دماغی، مادی، غرض کسی قسم کی ترقی بھی بغیر اعلیٰ اخلاق کے ممکن نہیں۔ ترقی کی عمارت جن بنیادوں پر استوار ہے ان میں سے ایک اخلاق ہے۔

ان کو اپنی جدوجہد اس وقت تک قائم رکھنی چاہیے جب تک وہ اپنے آپ کو مجتمع کرنے اور دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے قابل نہ ہوجائے۔ دوبارہ زندگی حاصل کرنا خارجی واقعہ نہیں ہے۔ یہ انا کے اندر زندگی کے عمل کی تکمیل ہے۔ یہ انفرادی ہو یا کائناتی، ہر حال میں یہ انا کی گزشتہ کامیابیوں اور آئندہ کی امیدوں کا ایک قسم کا جائزہ ہے۔ جہاں تک اشعار میں خودی کی تشریح کا تعلق ہے اقبال نے کافی اشعار خودی کے متعلق پیش کیے ہیں۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوۂ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اِک بوند پانی میں بند

اپنے نظریۂ اخلاق اور خاص طور پر اپنی بعد کی تحریروں میں اقبال فقر کو بہت اونچا درجہ دیتے ہیں۔ فقر کو عام طور پر بے کسی اور

مسکینی، مجبوری اور رہبانیت کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن اقبال فقر و استغنا سے وہ بے نیازی مراد لیتے ہیں جس سے مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو۔

اگر یہ وسائل ہوں تو اچھا اور اگر نہ ہوں تو بھی اچھا اگر وہ موجود ہوں تو ان کی موجودگی کے باوجود انسان ان میں گھر کر نہ رہ جائے وہ ان سے بے نیاز ہو نہ کہ ان کے متعلق فکر مند۔ وہ انھیں حاصل کرنے یا ان کی حفاظت کے لیے اعلیٰ اقدار کو قربان نہ کرے۔ بلکہ یہ تمام دنیاوی چیزیں اس کی اعلیٰ اقدار کی بنا پر اس کے قبضہ میں آجائیں لیکن اس کے باوجود وہ ان سب سے بالکل بے نیاز ہو۔

چیست فقر اے بندگان آب و گل
یک نگاہِ رابیں، یک زندہ دل
فقر کارِ خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است

اقبال اجتہاد کے زبردست حامی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر اجتہاد پر زور دیا ہے۔ وہ خود مذہبی اصولوں کو نئے علوم اور حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اجتہاد کی ضرورت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا"۔

خودی کے استحکام کا سب سے بڑا اور اہم نقطہ جو قابلِ وقعت ہے وہ عمل ہے۔ اور زندگی کی یہ بنیادی صفت ہے اس کے بغیر زندگی موت سے بدتر ہے۔ زندگی کا اصل مقصد عمل اور صرف عمل ہے لیکن اگر زندگی اور مقصد زندگی سکون و سکوت اور ابدی راحت قرار پائے تو عمل کے لیے زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔

نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا چلنا مدام چلنا
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لیکن عمل سے اقبال کی کیا مراد ہے؟ زندگی کی تسخیر کے لیے انسان کی حرکت جب اپنے آپ کو منظم کرتی ہے تو عمل کہلاتی ہے۔ عمل کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کائنات کی حرکت یا خلوت کا کوئی قانون انسان کے اصل مقصد سے متصادم ہو تو فطرت کے سامنے سر خم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ زندگی کے معرکہ میں انسان کی شکست ہوگی بلکہ عمل کی حرکت سے فطرت کے قانون کو تسخیر کر لینا چاہیے انسان کی سائنسی، تمدنی ترقی اسی اصول کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔

نوجوانوں کے قلوب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے گرم خون کی حرارتیں ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک سیلاب کی مانند اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی طاقت کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

اقبال جان گئے تھے کہ قوموں کی تخلیق ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ مغربی اقوام اپنی قوت عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں۔ اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبیات

و تخلیقات اہلِ مشرق کے واسطے بہترین ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ زندگی اور جدید فلسفے کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظامِ وحدت الوجود سے ہوتی ہے، لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم جس کو ریاضیات کے طریقِ استدلال سے پختہ کیا ہے۔ دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلسفۂ مغرب، بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس طلسمِ خیال کے اثر سے آزاد ہوگئے، جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لیے مختلف خواص ہیں اسی طرح انسان میں ایک اور خاصہ بھی ہے جس کو واقعات کہنا چاہیے ہماری زندگی واقعاتِ گردوپیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل و پیرا ہونے پر منحصر ہے مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس قوت سے کام لیتے ہیں۔

بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعات حاضرہ جن کو نظریات کے دلدادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بہ نگاہ حقارت دیکھتے ہیں اپنے اندر حقائق و معارف کا ایک گنج گراں مایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ انگریزوں کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں حسِ واقعات اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی دماغ یافتہ فلسفیانہ نظام جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ انگریز کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں، ابیات، ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ اس سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرثانی کریں۔ اقبال سے پہلے اردو شاعری میں خودی کا لفظ قابلِ احترام نہیں تھا۔ پرانے شعراء خودی کے خلاف تھے۔

ہائے پہنچا نہ گیا قیدِ خودی سے اس تک
اپنے ہی دام سے چھٹنا مجھے دشوار ہوا

(سودا)

یہ وہی خیال ہے جو حافظ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"تو خود حجاب حافظ از میاں برخیز"

اکبر الٰہ آبادی نے بھی خودی کی مذمت اس طرح کی ہے۔

مٹا دو رنگ و حدت میں خودی کا رنگ اے اکبر
اگر ثابت کیا چاہو تم اپنا معتبر ہونا

لیکن اقبال کا کہنا یہ ہے کہ خدا سے خودی کی آرزو کرو اور خودی سے خدا کو طلب کرو۔ اقبال کا کہنا ہے:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

متاعِ بے بہا ہے سوز و دردِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ شعر اقبال کی بہت بڑی دین ہے اور بیسویں صدی کے مزاج کا ہے اس لیے ضرب المثل بن گیا۔ (۴)

کیا دل ایک بار پھر سوز سے خالی قلوب بے حضور اور نگاہیں دیدہ بینا سے محروم ہوجائیں۔ یہی تو موقع ہے کہ ہم اقبال کے احسانات کا بدلہ چکائیں۔ ان کے افکار کو اپنائیں۔ مشعلِ خودی روشن کریں۔ ہر شاخ کو گل ہائے گلزار بنائیں۔ اپنی زندگی کے سماجی معاشی اور سیاسی غرضیکہ ہر پہلو کو اقبال کے کلام کی روشنی میں بہتر بنائیں۔

اس کی ضرورت جتنی موجودہ دور کو ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ نہ جانے پھر:

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روز گار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال صفحہ نمبر ۱۸-۶۰

۲۔ محمد احمد خان۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ صفحہ نمبر ۹۶۸

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال شناسی اور فنون۔ صفحہ نمبر ۱۵۰-۲۴۸

۴۔ علی سردار جعفری۔ اقبال شناسی۔ صفحہ ۵۷-۵۹

وضع اصطلاحات

وحید الدّین سلیم

صفحات: ۴۰۴

قیمت: =/۱۱۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

موضوعاتی فہرست

علاّمہ سر محمد اقبال

ڈاکٹر نثار احمد فیضی
ریسرچ فیلو خدا بخش لائبریری پٹنہ

(ماہنامہ "قومی زبان" کراچی میں علاّمہ اقبال پر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۰ء تک شائع ہونے والے مضامین کے اشاریے)

بہ ترتیب حروفِ تہجی

(آ)

مقالہ نگار	عنوان	شمارہ / صفحات
آصف دہلوی	اقبال اور مسئلہ تقریر	۴۷/۹ ص ۳۳-۳۴
آصف دہلوی	اقبال کی غزل	۴۷/۱۱ ص ۴۸-۵۴
آصف دہلوی راز	اقبال کا معیار ایمان و مومن	۴۷/۴ ص ۳۲-۳۶
آصف فرخی	ہائیڈل برگ میں آثارِ اقبال	۵۸/۱۱ ص ۹-۱۶
آصف فرخی	مجھے گھر یاد آتا ہے	۵۹/۴ ص ۴۷-۵۴
آفاق صدیقی	مکتوباتِ اقبال بنام سید سلیمان ندوی	۵۳/۱۱ ص ۲۰-۲۳
آفتاب احمد	اقبال اور یارانِ اقبال	۴۹/۱۲ ص ۴۸-۵۰

(الف)

ادارہ	اداریہ	۴۶/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۴۷/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۴۶/۱۱ ص ۳-۴

ادارہ	اداریہ	۴۷/۱۱ ص ۷-۸
ادارہ	اداریہ	۴۸/۱۰ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۴۸/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۴۹/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۴۹/۱۱ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۰/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۱/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۲/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۲/۱۱ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۳/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۳/۱۱ ص ۳-۵
ادارہ	اداریہ	۵۴/۴ ص ۳-۵
ادارہ	اداریہ	۵۵/۴ ص ۳-۴
ادارہ	اداریہ	۵۷/۱۱ ص ۳
ادارہ	اداریہ	۵۸/۱۱ ص ۳
ادارہ	اقبال یادگار	۵۷/۴ ص ۱۳-۱۵
ادارہ	علامہ اقبال اور بابائے اردو	۵۲/۱۱ ص ۵-۷
ادارہ	گاہے گاہے باز نجواں	۵۳/۴ ص ۱۰-۱۱
ادارہ	گردوپیش	۵۸/۴ ص ۸۹-۹۱
احساس مراد آبادی	مردِ قلندر (نظم)	۵۷/۱۱ ص ۲۷۰
احسن مارہروی	نذرِ اقبال (نظم)	۴۷/۱۱ ص ۲۶۳
احمد، احمد عبداللہ	میرا پسندیدہ شاعر اقبال	۵۸/۴ ص ۳۱-۳۴
احمد سجاد	اقبال، آہنگ اور انفرادیت	۵۰/۱۱ ص ۵-۱۰
احمد ہمدانی	خودی	۶۲/۱۰ ص ۲۳-۲۹
احمد رفاعی	کلامِ اقبال کے بعض منظوم تراجم	۴۷/۱۱ ص ۲۲۵-۲۴۶
ارشد عبدالمجید	اقبال کا پیغام (نظم)	۴۶/۴ ص ۱۹
ارشد عبدالمجید	اقبال کا ملت اسلامیہ کے لیے حیاتِ نو کا پیغام	۴۷/۱۱ ص ۱۵۱-۱۵۳
اظہر صدیقی	مثنوی اسرار و رموز	۴۷/۱۱ ص ۲۰-۳۱
افسر امروہوی	اقبال عطیہ الٰہی	۴۷/۱۱ ص ۲۶۵
اخلاق اثر	کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (حصہ اول)	۴۲/۴ ص ۲۹-۳۵

اعظم رضوی	اقبال عاشق رسول ﷺ	۴۹/۱۱ ص ۳۳-۴۰
اکبر رحمانی	علامہ اقبال سے لمعہ حیدر آبادی کے مراسم	۴۹/۴ ص ۲۶-۳۱
انصاری، اسلوب احمد	اقبال کی شاعری میں لالہ کی علامت	۶۲/۱۱ ص ۱۵-۲۲
انور خالد	کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد	۴۷/۱۱ ص ۲۰۸-۲۱۲

(ب)

برق مشکور علی	قرآن، مسلمان اور اقبال	۴۷/۱۱ ص ۱۴۳-۱۵۰
بشیر احمد ڈار	اقبال کے کچھ نئے خطوط	۴۷/۱۱ ص ۲۱۳-۲۲۲
بیگم نفیس مظہر	اقبال اور ذوقِ جمال	۴۷/۱۱ ص ۱۲۹-۱۳۸
بیگم نفیس مظہر	بنام اقبال	۴۷/۱۱ ص ۲۶۹

(ت)

تبسم کاشمیری	اقبال کا نظریۂ شاعری خطوط کی روشنی میں	۴۹/۴ ص ۱۳-۱۶
توقیر صدیقی	علامہ اقبال اپنے افکار کے آئینے میں	۴۶/۴ ص ۲۶-۲۷
توقیر صدیقی	علامہ اقبال اور تعلیم	۴۷/۴ ص ۳۷-۳۹
توقیر صدیقی	اقبال اور عشق	۴۹/۴ ص ۵۸-۵۹

(ج)

جان کاشمیری	اقبال کا پیام (نظم)	۵۳/۱۱ ص ۴۲
جعفری، شیر افضل	بحضور اقبال (نظم)	۵۲/۴ ص ۳۲
جعفری، شیر افضل	اقبالیہ (نظم)	۵۲/۱۱ ص ۴۳
جعفری، مرتضیٰ اختر	اقبال اور حق گوئی	۴۸/۱۰ ص ۵-۸
جلیل قدوائی	اقبال کے وظیفہ کے بارے میں ایک یادداشت	۴۶/۴ ص ۷۶
جلال پتنی	اقبال اور ایران ا ترجمہ گوہر نوشاہی	۴۸/۴ ص ۱۰-۱۷
جلیسری، صابر حسین	فکر اقبال کا ایک اہم پہلو	۵۹/۱۱ ص ۱۹-۲۴
جمال الدین محمد السعید	علامہ اقبال مصر میں ا ترجمہ عارف نوشاہی	۴۸/۱۰ ص ۲۷-۲۸
جمیل زبیری	علامہ اقبال اور ممنون حسن خاں	۵۷/۳ ص ۲۱-۲۷
جہانگیر عالم	اقبال اور پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم	۴۸/۱۰ ص ۵۴-۵۱

(ح)

حامد علی خاں	اقبالؒ (نظم)	۵۵/۴ ص ۵-۶
حبیب الرحمٰن (پشاور)	اقبال کا فلسفۂ زماں و مکاں	۴۷/۴ ص ۱۸-۲۶
حبیب الرحمٰن	مسلم کلچر کی روح اقبال کی نظر میں	۴۷/۱۱ ص ۹۲-۹۸
حسرت کاسگنجوی	اقبال کا پیغام	۴۷/۱۱ ص ۱۳۹-۱۴۲
حسن اختر	طالب علم اقبال	۵۴/۴ ص ۱۱-۱۳
حنیف شاہد	اقبال انٹرنیشنل سمپوزیم (باب ریاض)	۵۸/۱۱ ص ۷۳-۷۵
حنیف فوق	قائداعظم، اتاترک، علی برادران، رومی و اقبال کے بعض متوازی نقوش	۵۵/۱۱ ص ۵-۸
حنیف فوق	ترکی میں مطالعۂ اقبال	۵۵/۴ ص ۷-۱۴
حنیف فوق	اقبال اور تماشائے نیرنگ صورت	۶۱/۴ ص ۵-۹

(خ)

خان احمد سلیم	اقبال اور اردو	۴۸/۱۰ ص ۴۸-۵۰
خان رشید	مجھے ہے حکم اذاں	۴۶/۴ ص ۲۰-۲۱
خان رشید	اقبال اور تعلیم	۴۶/۱۱ ص ۵-۱۱
خان رشید	روحِ اقبال سے	۴۷/۱۱ ص ۲۶۶-۲۶۷
خان رشید	اے مدعیان حُبِّ اقبال	۴۸/۴ ص ۹
خاطر غزنوی	شاعرِ مشرق کے حضور (نظم)	۴۸/۴ ص ۹

(د)

دردانہ جلیل	اقبال، اسلام اور اشتراکیت	۴۹/۱۱ ص ۴۷-۵۲
دردانہ جلیل	اقبال مشاہیر عالم کی نظر میں	۵۰/۱۱ ص ۲۸-۳۱
دلشاد کلانچوی	اقبال اور زبان اردو	۵۳/۱۱ ص ۱۰-۱۳
دولت بانو حیدر علی	جنوبی ایشیا کے عمرانی کوائف اور اقبال	۴۷/۴ ص ۴۱-۴۲
دولت بانو حیدر علی	اقبال کے شعور تخلیق کا ابلاغ و اظہار	۴۷/۱۱ ص ۱۹۰-۲۰۴

(ر)

راحیلہ طلیب	علامہ اقبال اور عورت	۵۲/۱۱ ص ۴۴-۴۷

رحمت فرخ آبادی	بالِ جبریل ایک سندھی ادیب کی نظر میں	۴۸/۴ ص ۳۵-۴۱
رضوی، وقار احمد	پیامِ مشرق	۴۷/۱۱ ص ۱۳-۱۹
رضوی، عابدہ ریاست	اقبال ایک مستقبل شناس	۵۳/۴ ص ۱۹-۲۵
رضوی عابدہ ریاست	اقبال کا پیغام اور عصر حاضر	۴۶/۴ ص ۴۲-۴۶
رضوی، وقار احمد	اقبال کی غزل	۴۸/۱۰ ص ۵۱-۵۳
رسول رسا	اقبال کا تصورِ زمان	۴۹/۴ ص ۵-۱۲
رشدی حبیب اللہ	اقبال اور حیدر آباد دکن	۵۳/۱۱ ص ۲۴-۲۷
رشدی حبیب اللہ	اقبال نے اردو ادب کو کیا دیا	۴۷/۴ ص ۲۷-۳۱
رفیع عالم	اقبال اور عظمت انسانی	۵۵/۴ ص ۶۷-۶۹
رفیع عالم	اقبال ایک تنقیدی جائزہ	۵۴/۱۱ ص ۱۱-۱۸
رفیق خان	علامہ اقبال بحیثیت ماہرِ تعلیم	۵۸/۷ ص ۷۷-۷۹
رفیق خاور	اقبال اور مغرب	۵۲/۴ ص ۳۷-۳۰
رودولوی، آفتاب احمد	اقبال کا پیغام	۴۹/۱۰ ص ۳۷-۳۰
رودولوی، آفتاب احمد	اقبال اور یارانِ اقبال	۴۹/۱۱ ص ۱۵-۲۱
ریاض صدیقی	اقبال سائنسی شعور	۴۶/۴ ص ۳۷-۴۱
ریاض صدیقی	ارتقائے حیات اور اقبال	۴۷/۱۱ ص ۷۶-۸۰
ریاض صدیقی	اقبال۔ زمان سے لازمانیت تک	۴۹/۱۱ ص ۲۷-۳۲
ریاض صدیقی	ورق تازہ	۵۰/۴ ص ۱۵-۱۷
ریاض الحسن	اقبال ایک شعر اور پہلی جنگ عظیم	۵۰/۱۱ ص ۳۲-۳۳

(ز)

زیدی، صادق امام	علامہ اقبال اور سر علی امام	۵۵/۴ ص ۲۱-۲۴
زیدی، نظیر حسین	اقبال اور پیغام انسانیت	۵۰/۱۱ ص ۱۷-۲۲

(س)

ساقی جاوید	حکیم امت (نظم)	۵۱/۱۱ ص ۱۶
سرور اکبر آبادی	شکوہ، جواب شکوہ کا پس منظر	۴۷/۱۱ ص ۳۲-۳۶
سرور اکبر آبادی	اقبال کا فلسفۂ خودی	۵۵/۱۱ ص ۹-۱۳
سرور انبالوی	علامہ اقبال کی ظرافت	۵۳/۱۱ ص ۳۶-۴۱

سعدیہ نسیم	اقبال کا تصورِ خودی	۴۷/۱۱ ص ۱۰۵-۱۱۳
سعدیہ نسیم	اقبال کا نظریۂ تعلیم	۴۸/۶ ص ۲۳-۴۴
سلیم اختر	ملی وحدت نشاۃ ثانیہ کا علم بردار اقبال	۴۷/۱۱ ص ۱۵۱-۱۵۳
سیال، شمیم حیات	اقبالیات اور خواتین	۴۸/۴ ص ۲۹-۳۴

(ش)

شامی، جلیل الرحمٰن	اقبال اور آزاد شاعری	۴۶/۴ ص ۲۲-۲۵
شامی، جلیل الرحمٰن	شاعرِ مشرق سے (نظم)	۴۷/۱۱ ص ۲۶۸
شامی، جلیل الرحمٰن	اقبال کی ایک نظم اور اس کی بحر	۴۹/۴ ص ۱۷-۲۲
شاہد، محمد ایوب	ساقی نامہ کا فکری و فنی تجزیہ	۴۸/۴ ص ۲۳-۲۸
شاہد، محمد ایوب	اسبابِ زوالِ اُمت	۴۸/۱۰ ص ۳۶-۴۷
شاہدہ، چودھری	علامہ اقبال کے تعلیمی افکار	۴۹/۱۲ ص ۴۵-۴۷
شاہین، محمد پرویش	خوشحال و اقبال	۴۹/۱۱ ص ۲۲-۲۶
شاہین، محمد پرویش	اقبال اور پختون	۵۰/۱۱ ص ۲۳-۲۷
شاہین، محمد پرویش	اقبال اور سرحد	۵۲/۴ ص ۵-۱۰
شائستہ خان	اسرارِ خودی کا ایک فراموش شدہ ایڈیشن	۶۱/۴ ص ۱۰-۲۰
شجر نقوی	علامہ اقبال کی معنی آفرینی	۴۷/۱۱ ص ۲۰۵-۲۰۷
شکیل، عبدالغفار	اقبال کی تاریخ گوئی	۶۲/۴ ص ۱۵-۱۹
شمیم حنفی	اقبال کا حرفِ تمنا (از نقد و نظر علی گڑھ)	۶۲/۴ ص ۹-۱۴

(ص)

صابر آفاقی	اقبال اور کشمیر	۴۷/۱۱ ص ۷۱-۷۵
صابر حسین جلیسری	فکرِ اقبال کا ایک اہم پہلو	۸۵/۱۱ ص ۹-۱۶
صابر کلوروی	تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ (ایک جائزہ)	۵۷/۴ ص ۵-۱۲
صابر کلوروی	کتابیاتِ اقبال	۵۰/۱۱ ص ۱۱-۱۶
صدیق جاوید	اقبال اور اقتدارِ اعلیٰ کا عمرانی زاویہ	۶۲/۱۱ ص ۲۳-۲۹
صدیقہ ارمان	اقبال کے کلام میں تعلیمی عناصر	۴۷/۱۱ ص ۱۶۱-۱۸۲
صدیقی، آفتاب احمد	اقبال اور ہم	۵۱/۴ ص ۱۱-۱۵
صدیقی، رضی الدین	روحِ اقبال	۵۳/۴ ص ۱۰-۱۱

صدیقی، محمد امتیاز	اقبال کا نظریۂ فن	۵۰/۴ ص ۹-۱۴
صدیقی، محمد شمس الدین	اقبال اور خیال امروز	۵۷/۱۱ ص ۹-۱۳
صوفیہ رفعت	اقبال کا نظریۂ علم	۴۹/۴ ص ۴۸-۵۷

(ع)

عبدالرشید فاضل	اقبال اور قرآن	۴۶/۴ ص ۸-۲۱
عبدالرشید فاضل	اقبال کا نظریۂ ادب	۴۷/۱۱ ص ۵۵-۷۰
عقیل معین الدین	نجدی تحریک اور اقبال	۵۱/۱۱ ص ۳۲-۴۱
علیم صدیقی	اقبال اور ورڈس ورتھ	۵۱/۱۱ ص ۲-۳۱
علیم صدیقی	اقبال اور ظفر علی خاں	۵۳/۴ ص ۱۲-۲۳
عقیل معین الدین	اقبال اور سنوسی تحریک	۴۷/۴ ص ۸۱-۸۷
عقیلہ کیانی	اقبال اور عمرانی افکار	۴۸/۴ ص ۵-۸
عمان سلجوقی	اقبال اور جنوب مشرقی ایشیا	۴۹/۴ ص ۲۳-۲۵
عیدن، عنایت حسین	اقبال اور موریشش	۵۵/۴ ص ۱۵-۲۰

(ف)

فرخی، آصف سلیم	جاوید نامہ	۴۷/۱۱ ص ۳۷-۴۷
فہمیدہ حقیق	تعلیم اور اقبال	۵۷/۷ ص ۶۹-۷۳

(ق)

قادری، محمد ایوب	علامہ اقبال کا سفر دہلی ۱۹۰۵ء لندن روانگی کے موقع پر	۵۳/۴ ص ۲۴-۲۸
قدرت نقوی	علامہ اقبال اور سر تیج بہادر سپرو	۵۳/۱۱ ص ۱۴-۱۹
قربا شمی	مزار اقبال پر (نظم)	۵۴/۴ ص ۱۹

(ک)

کاظمی علی اکبر	مفکر، مصور، پاکستان، ڈاکٹر اقبال مرحوم۔ تقویم کے آئینے میں	۴۹/۱۱ ص ۵-۱۴
کلیم سہسرامی	پیش رفت تہران میں علامہ اقبال کو خراج عقیدت	۵۷/۴ ص ۵۳-۵۶

(گ)

گریوال، شیر محمد	اقبال کا تصور تاریخ	۴۶/۴ ص ۲۸-۳۰
گریوال، شیر محمد	اقبال اور تاریخ	۴۷/۱۱ ص ۸۸-۹۱
گریوال، شیر محمد	اقبال کا تصور تاریخ	۴۸/۴ ص ۱۸-۲۲

(م)

محمد جاوید اقبال	وحدت الوجود اور خودی	۵۲/۱۱ ص ۳۴-۴۲
محمد ریاض (تہران)	اقبال کی چند نکتہ آفرینیاں	۴۷/۴ ص ۵-۱۷
محمد ریاض (تہران)	اقبال کی اردو شاعری کے چند پہلو	۴۷/۷ ص ۵-۱۳
محمد ریاض (تہران)	اقبال کے اردو کلام میں فارسیت	۴۷/۱۱ ص ۱۸۳-۱۹۴
محمد ریاض (تہران)	اقبال کی مدحت آزادی اور مذمت غلامی	۴۸/۱۰۰ ص ۲۹-۳۵
محمد صادق میاں	اقبال کے دو اساتذہ	۵۲/۴ ص ۲۶-۳۱
محمد صادق میاں	اقبال اور تحریک پاکستان	۵۷/۱۱ ص ۱۵-۱۹
محمد صدیق شاد	اقبال کا تصور فرد و ملت	۴۹/۴ ص ۴۳-۴۷
محمد، داعی الاسلام	اقبال اور ان کی فارسی شاعری	۵۲/۱۱ ص ۸-۳۳
مظفر عباس	اقبال کے ہاں مرد مومن کا تصور	۴۶/۴ ص ۳۱-۳۴
مظفر عباس	اسلامی ریاست کی تشکیل اور علامہ اقبال	۴۸/۷ ص ۳۲-۳۹
معین زلفی	منصور حلاج اور اقبال	۵۱/۱۱ ص ۴۲-۴۸
ملک حسن اختر	اقبال اور الجیلی	۴۷/۱۱ ص ۱۱۴-۱۲۸
ملک حسن اختر	اقبال اور غزالی	۴۸/۱۰ ص ۹-۲۶
مولوی عبدالحق	اقبال مرحوم	۴۶/۴ ص ۵
مولوی عبدالحق	اقبال کی عظمت	۴۷/۱۱ ص ۹-۱۲
مولوی عبدالحق	اقبال	۵۳/۱۱ ص ۶-۹

(ن)

ناہید رخشاں صدیقی	اقبال کا فلسفۂ خودی	۴۹/۴ ص ۳۵-۴۲
ندوی، فضل القدیر	سبوچہ اقبال	۵۰/۴ ص ۵-۸
نسیم نیشو فوز	علامہ اقبال کا ثقافتی نظریہ	۵۴/۴ ص ۱۵-۱۷

نسیم نیشوفوز	جدید نطشے جدید تر اقبال	۵۸/۴ ص ۷۹-۸۳
نعیم الدین	تصور جبر و اختیار - رومی و اقبال میں	۵۱/۱۱ ص ۵-۱۰
نفیس مظہر	اقبال کی شاعری اور پیغام	۴۷/۱۰ ص ۳۰-۳۵
نصیر الدین	اقبال سے میری وابستگی	۴۹/۴ ص ۳۲-۳۴
نقوش نقوی	باب ریاض / یومِ اقبالؒ	۵۷/۱۲ ص ۴۱-۴۵
نقوی، آفتاب احمد	اقبال احیائے ملی کا نقیب	۴۷/۱۰ ص ۲۳-۲۹
نقوی، آفتاب احمد	فنونِ لطیفہ اقبال کی نظر میں	۴۷/۱۱ ص ۹۹-۱۰۴
نقوی، مسظر عباس	بالِ جبریل کی غزلیں	۶۲/۴ ص ۲۱-۲۸
نوید ظفر	اقبال اور تعلیم	۴۹/۱۱ ص ۴۲-۴۶
نیرنگ نیازی	اقبال جمالیات کے آئینے میں	۵۳/۱۱ ص ۲۸-۳۴
نیرنگ نیازی	اقبال جمالیات کے آئینے میں	۴۶/۴ ص ۳۵-۳۶

(و)

وحید عشرت	مکاتیبِ اقبال	۴۷/۱۱ ص ۲۵۳-۲۶۲
وحید قریشی	اقبالیات پر ایک اہم کتاب	۴۷/۱۱ ص ۲۲۳-۲۲۴
وفا احمد شرف الدین	شاعر مشرق	۴۷/۱۱ ص ۲۷۱

(ہ)

ہاشمی، رفیع الدین	سید وقار الدین سے اقبالیات پر ایک مصاحبہ	۵۹/۴ ص ۳۷-۴۵
ہاشمی، عبداللہ شاہ	فکر اقبال کا آفاقی پہلو	۶۱/۴ ص ۲۳-۲۶
ہاشمی فرید آبادی	تاریخ وفات سر محمد اقبال	۵۳/۴ ص ۶

(ی)

یوسف عزیز	کلام اقبال میں طنز و مزاح	۵۷/۱۱ ص ۲۴۷-۲۵۲

قومی زبان ہر گھر کی ضرورت

اُردو نثر میں مزاح نگاری

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

قیمت =/۲۵۰ روپے

شائع کردہ
انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹- بلاک (۷) گلشنِ اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

سعید کی پُراسرار زندگی

مصنف: ایملی حبیبی

مترجم: انتظار حسین

قیمت =/۱۲۰ روپے

شائع کردہ
انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹- بلاک ۷ گلشنِ اقبال کراچی

یادِ رفتگاں

شہید حکیم محمد سعید

پروفیسر سحر انصاری

حکیم محمد سعید کا سانحۂ ارتحال ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی لوگ اُن کے نام اور کام سے واقف تھے، ہر حساس دل سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار ہے۔ شہید حکیم محمد سعید نے رفتہ رفتہ اپنی شخصیت اور کارناموں کی وجہ سے ہر طبقے کے دلوں میں ایسی جگہ بنالی کہ مشکل سے کسی کو یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ حکیم محمد سعید کی کارکردگی اور اوصافِ ذاتی کی اتنی جہات ہیں کہ کسی ایک مضمون کیا، ایک کتاب میں بھی ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ طبیب، ادیب، سماجی قائد، رہنمائے تعلیم، معلمِ اخلاق، محبِ پاکستان، مجتہدِ دین، حافظ قرآن، سیاح، بچوں کے ہمدرد، منتظم، بین الاقوامی اہمیت کی شخصیت، ــــ غرض کس کس پہلو پر مختصراً لکھنا ممکن ہے۔

کم از کم تین عشرے قبل جب "ہمدرد صحت" اور "ہمدرد نونہال" کا دفتر قائدِ اعظم کے مزار کے قریب تھا اور میرے عزیز دوست مسعود احمد برکاتی اپنی جوانی کا دور ان رسالوں کو معیاری بنانے میں صرف کر رہے تھے، اکثر حکیم صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ اور آخری ملاقات اکتوبر ۱۹۹۸ء میں یوم جمہوریۂ چین کی تقریب میں ہوئی۔ اس اثنا میں گزرے ہوئے لمحات کو یکجا کروں تو ذاتی حوالے سے بھی حکیم صاحب کی ایک ناقابلِ فراموش تصویر ذہن و دل میں اُبھرنے لگتی ہے۔

حکیم محمد سعید ایک عملی، حوصلہ مند بے باک انسان تھے۔ وہ اصول پسند اور تنظیمی صلاحیتوں کو مکمل طور سے استعمال کرنے پر قادر تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا وصف اوقاتِ کار کی صحیح تقسیم اور اس پر سختی سے عمل درآمد کرنا تھا۔ حکیم صاحب نے پاکستان آکر جس طرح خالی ہاتوں اور خالی جیبوں سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور بے مثال ترقی کی وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مسلک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدا میں حکیم صاحب کی جیب اور بات ضرور خالی تھے لیکن ان کا ذہن کبھی خالی نہ تھا۔ وہ ایک مستقبل بین اور خیالات و افکار کی دولت سے مالا مال ذہن رکھتے تھے۔

حکیم صاحب نے طبِ مشرق کو جس طرح جدید شکل و صورت عطا کی اور اس کے فروغ کے لیے جن سائنسی خطوط پر کام کیا وہ ایک نمایاں پیش رفت تھی جس کے بعد نئے اطبا بھی سامنے آئے اور خاصا اہم تدریسی مواد بھی مہیا ہونے لگا۔

ہمدرد صحت، ہمدرد نونہال کے علاوہ انگریزی زبان میں شائع ہونے والے رسالے کتب اور دیگر مطبوعات نے بعض اہم موضوعات تک رسائی کو آسان اور ممکن بنا دیا۔ حکیم صاحب نے "شامِ ہمدرد" تسلسل کے ساتھ منعقد کیں اور اسے تقریباتی رُخ تک محدود نہیں رکھا بلکہ مقالات کی سلسلہ وار کتابی اشاعتیں بھی عمل میں آئیں۔

حکیم صاحب نے یونیسکو کے مشہور رسالے "کوریر" کو اردو میں "پیامی" کے نام سے جاری کیا اس کے کئی شماروں سے میرا بھی جزوی تعلق رہا۔ اس وقت تک ۸۴ زبانوں میں کوریر شائع ہوتا تھا لیکن اس میں اردو شامل نہ تھی۔ حکیم صاحب نے اردو کو یہ اعزاز دلایا۔

حکیم محمد سعید مشرق اور اسلام کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی فکری، سائنسی اور نظریاتی روایات کا سُراغ لگایا اور اس قدر توجہ اور انہماک سے کام کیا کہ عالمی سطح پر اس کی پذیرائی ہوئی۔ ابن الہیثم، البیرونی، بوعلی سینا اور صدر الدین عینی کے سلسلے میں "یونیسکو" کو جس طرح حکیم صاحب نے ہموار کیا وہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ دراصل روایت کو قدامت کے مترادف سمجھا جاتا ہے تو سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ روایت کا قدوقامت کسی قوم میں شامل نہ ہو تو وہ اپنی سربلندی کا احساس اور اعلان کس طرح کرے گی۔ اس نقطۂ نظر سے حکیم صاحب نے فقید المثال کارنامے انجام دیے ہیں۔

حکیم صاحب ایک ادیب کی حیثیت سے بھی اپنا خاص اسلوب رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں ذہنی بیداری مشاہدے کی قوت، اسلوب کی جاشنی اور سادگی جگہ جگہ بصیرت اور افادیت ملتی ہے۔ پھر جہاں ضرورت ہوئی شگفتگی اور مزاح بھی شامل ہو گیا۔ ان کے سفرناموں کے علاوہ حکیم صاحب کی اس تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا جو انھوں نے اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید صاحب کے لیے "نذرِ حمید" میں شمولیت کی خاطر لکھی تھی۔ یہ اردو کے چند غیر معمولی خاکوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

حکیم محمد سعید نے مدینتہ الحکمت اور اس کے قابلِ قدر کتب خانے کے قیام سے آئندہ نسلوں کے ذہنوں تک علم کی روشنی عام کرنے کا بندوبست کر دیا ہے۔ بلاشبہ یہ ان کا اس قوم پر بہت بڑا احسان ہے اور اس کا بدلہ اسی طرح چکایا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب نے مشرق کی بیداری اور صحت مند انقلاب کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر پانے کے لیے ہر شخص اپنی بساط بھر کوشش کرے اور خود کو ان کے مشن میں شامل سمجھے۔ حکیم صاحب خود تو زندہ جاوید ہوگئے۔ اب جو لوگ ان کے راستے پر چلیں گے وہ اپنے ہی انداز میں کوئی مثال قائم کر کے خدمت انسانیت کی روایت کا حصہ بن سکیں گے۔

اُردو، قومی یکجہتی اور پاکستان

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

یہ کتاب اُردو کے حوالے سے قومی یکجہتی پر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔
جسے اُردو کے مزاج شناس اور ممتاز نقاد و محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے
بڑی محنت، چھان بین اور مستند حوالوں سے لکھا ہے

قیمت ساٹھ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ - بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

حکیم صاحب

مسعود احمد برکاتی

شخصیت مختلف الجہات نہ ہو اور لکھنے والا اس کا ہم عصر بھی نہ ہو تو بہت سی تفصیلات چھٹ چھٹا کر اور چھن چھنا کر اجمال کی گرفت میں آسکتی ہیں۔ بہت سے پہلوؤں کو بُعد زمانی نگل جاتا ہے اور وقت کی کسوٹی معاصرت کے عدم توازن کو ہموار کر دیتی ہے۔ اس طرح بعض تفصیلات اور جزئیات کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور بعض پہلوؤں کو ان کے حقیقی اور تاریخی تناظر میں شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہم عصر لکھنے والا ایک تو ذاتی جذبات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوسکتا دوسرے اس کے لیے اہم اور کم اہم کا قطعی فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ آج اسے جو کام کارنامہ معلوم ہو رہا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ وقت کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد قابلِ ذکر بھی نہ رہے اور جو کام اس وقت معمولی نظر آرہا ہے وہ اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے مہتم بالشان کارنامہ قرار پائے۔ حکیم محمد سعید کے شخصی یا ذاتی مطالعے میں یہی صورت حال درپیش ہے۔ تاہم مجھے ہمراہی اور رفاقت کے جو فوائد حاصل ہیں وہ اپنی جگہ اہم ہیں اس لیے کوشش کی ہے کہ حقائق کو معروضی نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا جائے۔ یہ کوشش بھی ہے کہ جس کیفیت کو غالب نے مستثنیٰ تحریر کہا ہے وہ بھی غائب نہ ہو جائے۔

حکیم محمد سعید کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو حرکت ہے۔ وہ ایک متحرک ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے کاموں میں ہم جو غیر معمولی رنگا رنگی اور تنوع دیکھتے ہیں وہ اسی متحرک اور اخاذ ذہن کا کرشمہ ہیں ان کا ذہن بند گلی نہیں ہے بلکہ گیٹس کے الفاظ میں ہر قسم کے خیالات اور تجربات کے لیے ایک شاہراہ عام (THOROUGFARE) ہے۔ ان کے ذہن میں خیالات کی مسلسل آمد ہوتی ہے اور وہ ان خیالات کو عمل میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ خیالات کا یہ ورود شاعرانہ انداز بیان کے بجائے منصوبوں اور عزائم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خیالات دن کے خوابوں اور مجہول استغراق کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور گوش ہوش سے سننے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے معمولات کا ایک حصہ تنہا نشینی بھی ہے جسے وہ ایک زمانے میں "اعتکاف عامی" کہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ معتکف ہو گئے ہیں اور اتنے دن تک نہ وہ کسی سے ملیں گے اور نہ کسی مسئلے میں ان سے رجوع کیا جاسکتا ہے چاہے وہ مسئلہ کتنا ہی اہم ہو۔ یہ اعتکافی مدت پوری یکسوئی کے ساتھ مسائل کا جائزہ لے کر خیالات کو پکانے اور منصوبہ بندی کرنے کے لیے ہوتی تھی۔

حکیم صاحب نے اپنی عمر کے ابتدائی ۲۸ - ۲۹ سال اپنے برادر بزرگ حکیم عبد الحمید صاحب کے ساتھ گزارے۔ انھی کی تربیت نے ان کو حکیم محمد سعید بنایا، خود حکیم صاحب متعدد بار اس کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ محنت، لگن، یکسوئی اور سلامت روی

کے اجزا حکیم صاحب کی شخصیت میں بڑے بھائی کی ہی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ حکیم عبدالحمید کی تربیت کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے پر اپنے چھوٹے بھائی کو جد و جہد کی طرف راغب کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم صاحب کی نظر میں اپنے برادرِ محترم کی حیثیت ایک آئڈیل شخصیت کی ہے۔ بچپن میں حکیم صاحب کے مزاج میں کھلنڈراپن تھا اور شاید ہی کوئی کھیل ہو جو انہوں نے نہ کھیلا ہو ان کا بچپن گلی ڈنڈے، شطرنج اور کیرم سے لے کر بیڈمنٹن اور فٹ بال تک سے عبارت ہے۔ ٹینس کھیلنے کے لیے تو اب بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

پاکستان بنا تو حکیم صاحب اپنی زندگی کی تیسری دہائی مکمل کر رہے تھے اور کھلنڈراپن ختم ہو گیا تھا، کیوں کہ ۱۹۳۹ء میں وہ طبیہ کالج دہلی سے طب کی سند لے چکے تھے اور ۱۹۴۱ء سے ہمدرد صحت کی ادارت میں بڑے بھائی کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمدرد دواخانے کی تعمیر و ترقی کا اہم دور تھا جس میں دونوں بھائی شریک تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب حکیم صاحب کو بتدریج ذمہ داریاں سونپنی شروع کیں اور خوش اسلوبی سے تمام کام سکھائے۔ حکیم صاحب میں بڑے بھائی سے زیادہ تیزی اور تیز رفتاری تھی۔ اس کا خوش گوار اثر ہمدرد کی رفتار ترقی پر نمایاں ہوا اور نہ صرف ہمدرد کے کاروبار کو وسعت دینے میں بلکہ اس کو شہرت عام دینے میں حکیم صاحب کی ذہانت، شوق اور زمانے کے تیور سمجھنے کی صلاحیت نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

آزادی کے بعد حکیم محمد سعید صاحب نے پاکستان کا انتخاب کیا۔ شاید ان کا مزاج اور طبیعت کی جولانی آزاد فضا کی طالب تھی۔ جے جمائے اور ترقی پذیر کاروبار کے مقابلے میں انھوں نے نئے اور بنتے ہوئے ملک میں نئے سرے سے جد و جہد اور پُر مشقت زندگی کو اختیار کیا۔ حکیم صاحب نے کراچی میں ایک چھوٹے سے کرائے کے کمرے اور کرائے ہی کے فرنیچر میں اس عظیم الشان ادارے کی بنیاد ڈالی جس نے آج متعدد ثقافتی اور تعلیمی اداروں کو جنم دیا اور جو ہمدرد پبلک اسکول سے لے کر ہمدرد یونیورسٹی تک کا بانی ہے اور اب اگر یہ کہا جاتا ہے کہ حکیم محمد سعید خود اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں تو یہ الفاظ اپنی معنویت کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔

حکیم صاحب بتاتے ہیں کہ کراچی میں انھوں نے ابتدا قوتِ لایموت حاصل کرنے کے لیے نوکری بھی کی۔ یہاں متعدد ایسے اصحاب تھے جن سے ان کے دوستانہ روابط تھے اور وہ یہاں مقتدر تھے، لیکن خود داری اور خود نگری نے ان کے سوائے اپنی صلاحیتوں اور قوت عمل کے کسی اور طرف دیکھنے نہیں دیا اور وہ پوری یکسوئی سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ مطب اور دواسازی کے مسائل سے نمٹنے کے علاوہ طب مشرقی کی ترویج و اشاعت کو انھوں نے شروع ہی سے اپنی ترجیحات میں شامل رکھا جس کے لیے سب سے پہلے ہمدرد صحت کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اور پھر چند سال بعد بچوں کے لیے ہمدرد نونہال کا اجرا ان کی تعلیمی تحریک کی بنیاد بنا جو اب ہمدرد یونی ورسٹی تک پہنچ گئی ہے۔ اشاعت کتب کے لیے ایک اشاعتی شعبے کا قیام اور طبی، دینی اور علمی ادبی کتابوں کی اشاعت بھی حکیم صاحب کے ذوق نمو کی آئینہ دار ہے لیکن مطب کو ان کی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے انھوں نے اپنی طبیب کی حیثیت کو ہمیشہ اولیت دی ہے۔ جس باقاعدگی اور پابندی سے وہ مطب کرتے ہیں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ کسی بیرون ملک کے طویل دورے کے بعد بھی اگر وہ رات کو وطن واپس پہنچے ہیں تو وہ آنے والی صبح مطب میں موجود ہوتے ہیں اور اسی توجہ اور دل جمعی کے ساتھ مریضوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ان کی خصوصیت ہے۔ چاہے وہ وزیر رہے ہوں یا گورنر، مطب جانا اور مریضوں کو مشورہ دینا انھوں نے کبھی نہ چھوڑا۔ ہر ہفتے کراچی میں دو دن مطب کرنے کے علاوہ وہ لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں ہر مہینے دو دن کے لیے مطب کرتے ہیں۔ جب پاکستان دولخت نہیں ہوا تھا تو وہ ہر مہینے

ڈھا کے بھی جایا کرتے تھے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ نو عمری میں، میں طبیب بننے کے بجائے صحافی بننا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا، کہ حکیم صاحب نے فنِ طب اپنایا کیوں کہ انھوں نے عملی اور علمی دونوں میدانوں میں طب کی اشاعت و ترویج کے لیے جو غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں وہ شاید تشنۂ تکمیل رہ جاتے۔ آج وطن عزیز میں طب مشرقی کو مقبولیت اور عظمت کا جو مقام حاصل ہے اس میں سے حکیم صاحب کو منہا نہیں کیا جاسکتا۔ پھر طب کو جدید زبان میں اور بین الاقوامی سطح پر پیش کرنے اور عالمی ادارۂ صحت سے منوانے کی خدمت بھی صحافی محمد سعید کی نہیں بلکہ حکیم محمد سعید کی مرہونِ منت ہے۔

طب کو پاکستان میں بڑے مشکل دن بھی دیکھنے پڑے ہیں۔ شروع میں تو معمولی جڑی بوٹیوں کی فراہمی بھی ایک کارے دارد پھر پہلی جمہوریت کشی کے بعد ایک فوجی وزیر صحت نے تو ایک طبی وفد سے صاف کہہ دیا تھا کہ مراعات کا کیا سوال ہے؟

ہم اس اتائیت یعنی طب کو خلاف قانون قرار دینے والے ہیں، مگر حکیم صاحب نے شب و روز جاگ کر اور جگا کر تحریک چلائی اور انھی صاحب کو اطبا کے رجسٹریشن کا قانون پاس کرنے پر مجبور کر دیا۔ حکیم صاحب خالص طبیت ہیں، اپنے معالجات میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے، تالیفی ادویہ استعمال نہیں کرتے، لیکن طریق علاج کے بارے میں وسیع نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ تحقیق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جدید طب اور سرجری کی مفید ترقیوں کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ علم کی پیش رفت کے قائل ہیں۔ اگر کسی مرض کا علاج ایلوپیتھی میں یا ہومیوپیتھی میں بہتر ہو سکتا ہے تو مریض کو اس سے رجوع کرنے کا مشورہ دے دیتے ہیں، لیکن فطری طریق علاج کی شفا بخشی پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ اور اب تو ساری دنیا نباتات کا گن گا رہی ہے۔

آئن سٹائن کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا، وہ جس صابن سے نہاتا تھا اسی سے شیو بھی کر لیتا تھا۔ اپنے دور کا یہ سب سے بڑا سائنس داں کہتا تھا کہ دو قسم کا صابن استعمال کرنے سے زندگی بڑی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ سفید شیروانی اختیار کرنے کا محرک یہ ہے کہ شیروانی پہنتے وقت رنگ کے انتخاب میں توجہ اور وقت صرف نہ ہو۔ حکیم صاحب بھی وقت کی فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتے۔ وقت کی کفایت شعاری کوئی ان سے سیکھے۔ وہ اتنے کام اور اتنے متنوع، کام کرتے ہیں کہ مشکل سے یقین آتا ہے۔ علاج معالجے، تحریر و تصنیف انتظامی اور دفتری امور، میٹنگیں، خطوط نویسی، اخبار بینی، سفر، جلسے، کانفرنسیں، تقریریں، سماجی تقریبات میں شرکت اور نہ معلوم کتنے کام کرتے ہیں اپنے نام موصول ہونے والے خطوط ضرور پڑھتے ہیں اور ان کے جوابات بہت التزام کے ساتھ دیتے ہیں۔ ملک میں اور بیرون ملک خطوط خود بھی خاصی تعداد میں لکھتے ہیں۔ بچوں کو بھی بڑی شفقت سے خطوط لکھتے ہیں بچے حکیم صاحب کو خط لکھتے ہیں تو "پیارے انکل" یا میرے پیارے دوست" سے مخاطب کرتے ہیں۔ حکیم صاحب بھی اپنے آپ کو "تمہارا دوست اور ہمدرد لکھتے ہیں۔ ہمدرد نونہال میں کھوسٹ کے ایک بچے کا مضمون چھپا تو اسے پڑھ کر اس بچے کو خط لکھا کہ تمہارے قصبے میں زلزلہ آیا تھا، اپنی خیریت سے مطلع کرو۔ ہمدرد نونہال شائع ہوتا ہے تو وہ دوسرے دن پورا رسالہ پڑھ کر بھیج دیتے ہیں۔ سرخ قلم ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں اور اس کو فراخ دلی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا مطالعہ وہ رات کو سونے سے پہلے بستر پر کرتے ہیں۔

ذکر تھا حکیم صاحب کے وقت پر حکومت کرنے کا۔ ان کا عمل اس کا گواہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ وقت کی قلت کی بے جا شکایت کرتے ہیں۔ وقت کی کمی نہیں بلکہ اس کو ضائع نہ کرنے کے سلیقے کی کمی ہوتی ہے۔ ہم وقت کو نہایت بے دردی سے ضائع کرتے ہیں، بلکہ بڑی سفاکی سے اپنے وقت پر خود ڈاکا ڈالتے ہیں اور پھر نہایت بھولے پن سے خود ہی چور کو تلاش کرتے

ہیں۔ حکیم صاحب وقت کی دولت کو خوب خرچ کرتے ہیں، لیکن لٹاتے نہیں بلکہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وقت اور علم کا مزاج یہ ہے کہ اس کو جتنا استعمال کرو اتنا ہی بڑھتا ہے۔ حکیم صاحب اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں اس لیے وہ وقت کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ وقت ان کے پیچھے بھاگتا ہے۔

حکیم صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں سفر کو بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے پہلا سفر ۱۹۵۲ء میں اپنے برادر محترم کے ساتھ کیا تھا اور جنوب مشرقی ایشیا کے کئی ممالک میں گئے تھے۔ دوسرا سفر ۱۹۵۶ء میں کیا اس سفر میں بھی دونوں بھائی ساتھ تھے یہ طویل سیاحت تھی اور کوئی تین مہینے تک جاری رہی۔ یہ یورپ کا پہلا سفر تھا۔ اس کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ مطالعہ اور مشاہدہ تھا۔ اس سفر میں حکیم صاحب نے ترقی یافتہ دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد تو حکیم صاحب کے سفروں کی تعداد کا شمار مشکل ہے۔ آئے دن سفر کرتے ہیں۔ دنیا کے اکثر قابلِ ذکر ممالک میں وہ ایک سے زیادہ بار جا چکے ہیں۔ ان سفروں نے ان کے ذہن کے دریچے کھول دیے ہیں اور مشاہدات سفر نے مطالعہ کتب سے زیادہ ان کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ہر ملک کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملتے ہیں، ان سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور ان کے افکار سے استفادہ کرتے ہیں۔ دنیا کے دانش وروں کی دوستی نے خود ان کو، ہمدرد، کو اور پاکستان کو فائدہ پہنچایا۔ اب تک وہ اردو کو دس سفر نامے دے چکے ہیں اور بچوں کے لیے تو ان کے سفر ناموں کی تعداد ۲۵ تک پہنچ چکی ہے۔ اس طرح حکیم صاحب بدلتی ہوئی دنیا، علم کی پھیلتی ہوئی سرحدوں اور تہذیب کے نئے رخوں سے نہ صرف خود آگاہ ہوئے بلکہ انھوں نے اردو ادب کی ثروت میں بھی اضافہ کیا۔

اردو کی بات چل نکلی ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ اردو کی ترقی سے حکیم صاحب کو غیر معمولی دلچسپی ہے اور اس کا ایک مظہر ان کی تصانیف کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ادارہ ہمدرد کی دفتری زبان اردو ہی ہے ہمدرد کے مختلف شعبوں میں زیادہ تر کام اردو ہی میں ہوتا ہے اور سوائے اس کے کہ کوئی مجبوری ہو انگریزی کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ حکیم صاحب نے یونیسکو میں اپنے تعلقات سے کام لے کر یونیسکو کے ماہنامہ کوریئر کا اردو ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں جاری کرایا اور چودہ سال تک یہ علمی اور عالمی رسالہ پوری پابندی وقت اور باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ اس کے ذریعہ سے سائنسی، ثقافتی اور تعلیمی موضوعات پر وہ مواد اردو میں منتقل ہوا جس نے اردو کی ثروت میں وقیع اضافہ کیا۔ افسوس کہ نوکر شاہی کو یہ گوارا نہ ہوا اور وزارت تعلیم کے بقراطوں نے اس رسالے کی اشاعت بند کرنے کی یہ حسین تدبیر اختیار کی کہ ہمدرد فاؤنڈیشن سے یہ رسالہ لے کر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے سپرد کر دیا جس نے ایک سال میں اس ماہ نامے کے صرف تین شمارے نکالے اب تو اس کی کئی برسیاں ہو چکی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کیا جوہر ہے کہ جس کی بنا پر ایک شخص نے بے سروسامانی اور کم وسائل کے باوجود اتنی ترقی کی، اتنے اعزاز حاصل کیے، اتنے ادارے بنائے، اتنی تحریکیں چلائیں، اتنے عہدے حاصل کیے، اتنی دنیا دیکھی، اتنی محبت اور عزت پائی!

ہمارے لیے اور خصوصاً نوجوانوں کے لیے حکیم صاحب کی زندگی میں بڑا سبق ہے!

(مسعود احمد برکاتی کا یہ مضمون اس سے پہلے قومی زبان ماہ اپریل ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے جب انجمن نے جناب حکیم محمد سعید کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا تھا۔)

جیلانی بانو کا تخلیقی سرمایہ- ایک مختصر تعارف

پروفیسر سحر انصاری

جب کسی ادیب کی شہرت حوالے کے طور پر پیش ہونے لگے تو معاشرے میں عام طور پر اس کے متعلق تین طرح کے افراد ملیں گے- اوّل وہ جو اس ادیب کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، اُس کی تحریریں اور اس پر لکھی جانے والی تحریریں سب کچھ ان کی نظر سے گزر چکی ہوں گی- دوم وہ جو اس ادیب کے سلسلے میں اوسط درجے کی واقفیت رکھتے ہوں گے اور تیسرے شاید وہ ہوں جو بہت کم جانتے ہوں- ممکن ہے ان کا واسطہ ادب یا اس ادیب سے بالکل شروع شروع کا ہو-

جیلانی بانو فکشن کی دنیا میں ایک ایسی مصنفہ ہیں جن کی شہرت حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہے- چناں چہ جتنی مدت انھوں نے ادب کی تخلیق میں صرف کی ہے اور جس قدر تخلیقی سرمایہ ان کے دامن میں ہے اس کے پیش نظر ان کا بنیادی نوعیت کا تعارف کرانا تحصیل حاصل ہوگا-

جیلانی بانو کا اسلوب، زبان، تخلیقی شعور، موضوعات اور ادب میں ان کا مقام- یہ سب باتیں جدید ادب کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں- اب ان پر کوئی انوکھی نوعیت کا اضافہ ممکن نہیں- صرف زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے کوئی نئی یا مختلف بات کہی جاسکتی ہے-

لیکن نووارداںِ بساطِ ادب یا قارئین کے طبقۂ سوم کی بات تو پھر بھی باقی رہ جاتی ہے- ان کا خیال کرتے ہوئے اجمالاً اور انتہائی مختصر الفاظ میں جیلانی بانو کا ازسرِ نو تعارف کرادینا چاہتا ہوں-

بدایوں، جسے مدینۃ الاولیا کہا جاتا ہے، برصغیر کا ایک مردم خیز خطہ ہے- اسی شہر کے ایک معروف شاعر علامہ حیرت بدایونی ترکِ سکونت کرکے حیدر آباد دکن آگئے- اس زمانے میں فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، آزاد انصاری وغیرہ کے کلام سے شہر حیدر آباد کی ادبی فضا گونج رہی تھی- جیلانی بانو علامہ حیرت بدایونی کی صاحب زادی ہیں- انھوں نے اپنی تربیت اور گھریلو ماحول کا یہ اثر قبول کیا کہ کم عمری ہی میں لکھنے لکھانے کی طرف مائل ہوگئیں اور جلد ہی ادبی دنیا میں ایک نام اور مقام پیدا کرلیا-

میں نے جیلانی بانو کی تحریروں میں ابتداً ایک ناولٹ "جگنو اور ستارے" اور ایک کہانی "سات سُر" سے خاص تاثر قبول کیا- پھر جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "دشنی کے دینار" پاکستان سے شائع ہوا تو ان کے بارے میں ایک بات طے ہوگئی کہ سرحدوں کی فکر ان کے فن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی وہ پاکستان میں بھی اتنی ہی مقبول ہیں جتنی ہندوستان میں-

جیلانی بانو کا ایک اہم انفرادی وصف یہ ہے کہ اس سن وسال میں جب کہ لکھنے والے بالخصوص خواتین رومانیت کو عزیز رکھتی ہیں، جیلانی بانو نے سماجی شعور اور انقلابی جدوجہد سے تعلق رکھنے والی کہانیاں لکھیں- انھوں نے افسانے کی انقلابی تحریکوں اور ان میں پیش کی جانے والی بے مثال قربانیوں کی بڑی دردمندی اور فن کی بھرپور تکمیلیت کے ساتھ لکھا ہے- اسی طرح حیدر آباد دکن کی

تہذیبی زندگی کو بھی انھوں نے اپنے ناولٹ، کئی کہانیوں اور ناول "ایوانِ غزل" میں موضوع بنایا ہے۔ لیکن جیلانی بانو نے حیدر آباد کی تہذیب کو نہ عزیز احمد کی آنکھ سے دیکھا اور پیش کیا ہے نہ واجدہ تبسم کے انداز میں جیلانی بانو نے چوں کہ ابتدا ہی میں معاشرے کی اصل روح کو گرفت میں لے لیا تھا اس لیے وقت کے تغیر اور فن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ان کا معاشرتی شعور پختہ تر ہوتا گیا۔

"ایوانِ غزل" اپنی نوعیت کا ایک منفرد ناول ہے۔ بوجوہ یہ ناول پاکستان میں بہت کم زیر بحث آیا ہے لیکن اس کا مطالعہ ایک عہد اور ایک تہذیب تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

جیلانی بانو ایک سطح اور معیار کے ساتھ فکشن لکھتی ہیں۔ ان کے یہاں معیار اور کیفیت کے ساتھ کمیت بھی ہے۔ روشنی کے مینار کے علاوہ "روز کا قصہ" "پرایا گھر" ان کے ایسے افسانوی مجموعے ہیں جن میں محولہ بالا موضوعات سے ہٹ کر بھی انسان کی نفسیات اور سماجی رویوں کا گہرائی اور لطیف پیرائے میں اظہار کیا گیا ہے۔ جیلانی بانو کی کئی کہانیاں دو اور دو چار کی طرح منطقی نتیجے پر پہنچ کر ختم نہیں ہوجاتیں۔ وہ سوچنے کی بہت کچھ گنجائش چھوڑ کر ایک بظاہر ادھورے پن میں کہانی کا اختتام کردیتی ہیں جو قاری کو تجرباتِ زیست تک پہنچنے اور تجزیہ کرنے کے مسلسل سفر میں رکھتی ہے۔ "روز کا قصہ" میں افسانوں کے علاوہ دو ناولٹ ابارشن اور گڑیا کا گھر بھی شامل ہیں جو موضوع، Treatment اور مقامی زبانوں کے بے تکلف استعمال کا عمدہ نمونہ ہیں۔

جیلانی بانو کا ایک اور قابلِ ذکر ناول "بارش سنگ" ہے جو ۱۹۸۵ء میں پاکستان میں شائع ہوا۔ ناول کا نام بھی فیض کے کلام سے ماخوذ ہے اور ناول کے شروع میں فیض کی نسبتاً طویل نظم جس کا عنوان "آج کے نام" ہے مکمل صورت میں درج کی گئی ہے۔

یہ ناول بھی تلنگانے کے ماحول میں لکھا گیا ہے۔ کھیتی باڑی، زمین داری، فصلوں کی افزائش اور تباہی، پھر اس کے پردے میں انسانی رویوں کے منفی و مثبت رُخ حقیقت پسندانہ پیرائے میں ابھارے گئے ہیں۔

"اس احوال کا ایک اہم عنصر یہ ہے کہ "گاؤں میں جب ہیضے یا چیچک کی بلائیں آتی تھیں تو سب ہندو مسلمان مل کر یوچھا کی پوجا کرتے ہیں"۔

اسی طرح دونوں فرقے محرم بھی مل جل کر مناتے ہیں۔

طبقاتی نظام، آجر اور اجیر ظالم اور مظلوم مختلف کرداروں کے حوالوں سے اس ناول میں ابھرتے ہیں لسانی اعتبار سے بھی جیلانی بانو کا یہ ناول اہم ہے۔ کیوں کہ شہری اور ادبی پیرایوں کے ساتھ ساتھ تو اس میں تلنگانے اور خالص حیدر آبادی لب و لہجے کی بھی جھلکیاں مسلسل نظر آتی ہیں۔

سقوط حیدر آباد پر عام شہریوں اور دیہات کے باشندوں کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ "بارش سنگ" کا مرکزی کردار سلیم شروع سے آخر تک ناول کے تمام واقعات کا بنیادی حوالہ بنا ہوا ہے۔ یہ ناول سماجی حقیقت نگاری یا Social Realism کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ جیلانی بانو نے سقوط حیدر آباد سے قبل اور اس کے بعد سیاسی تغیرات کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اور کہیں بھی کرداروں یا واقعات کو Romanticise کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

"جگنو اور ستارے" سے "بارش سنگ" تک کا سفر جیلانی بانو کے فنی ارتقا اور شعور کی پختہ کاری کی ایک واضح مثال ہے۔ ان کا کوئی قاری یا ناقد اس حقیقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے طرزِ فکر اور رنگِ احساس سے کبھی نہیں ہٹیں اور اس کے باوجود اُن کے تخلیقی سرمایے میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے۔

شیگے جی تسُوبوئی (جاپانی شاعر)

عبدالعزیز خالد

(۱)
ایک کنکر

اک رہگزر پر میں چلوں
کنکر کو ٹھوکر مارتا
ایک ابر آگیں سہ پہر
ٹھنڈی ہوا
اک رہگزر پر میں چلوں
کنکر کو ٹھوکر مارتا
کنکر مری ٹھوکر سے کھائے
لڑھکنی پر لڑھکنی
بیدار ہوگا کب تو اے کنکر بتا!

(۲)
بہار

ہر روش رنگ رنگ پھول کھلے
غنچہ آسا مگر لب ان کے سلے
بھنبھناتی ہیں مکھیاں، کیڑے
سر سے پا تک بھرے ہیں زرِ گل سے
میں کسی کے خیال میں گم ہوں
کہو خوشبو سے مجھ کو مت چھیڑے!

(۳)
اک بھک منگا

اک بھک منگا ہے
زد میں ہوا کی
اس کو اُٹھا کر
پھینکیں گلی میں
لہریں ہوا کی
اس بھک منگے کے
ننگے بدن پر
کھونے کو کیا ہے؟
نہ فکر کالا!
نہ خوفِ رہزن!
ہے عین ممکن
برفیلے جاڑے
کے ہڈیوں میں
گھستے تھپیڑے
کھا کر کسی شب
دل میں ترے بھی
اک تارہ ٹوٹے!
آنسو کا قطرہ
ہرگز نہ لیکن
اس کو بنانا
بلکہ بنانا
غصے کی اینٹھن
آنکھوں کی سوزش
باطن کی کھولن!

مرے گھر کے دریا!

جُوکی چی یاگی (جاپانی شاعر)

عبدالعزیز خالد

مرے گھر کے دریا!

مرے گھر کے دریا!

وہی نغمہ سرخوش و دلنشیں ہے تمہارا ابھی تک؟

اسی طرح اب بھی

تمہاری کف آلود لہریں

مری ماں کے اسپید پیروں کا لیتی ہیں بوسہ

طواف ان کا کرتی ہیں ویسے ہی اب بھی؟

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

سرودِ حرم

منظور اعظمی

صفحات ۲۰۸، قیمت = /۱۲۵ روپے

منظور احمد خاں، ۶۷-اے- عالمگیر سوسائٹی ماڈل کالونی- کراچی

نعت گوئی میں ارتکازِ فکر ضروری ہے اور ارتکاز کا محور و مرکز ذاتِ واسوۂ رسول ﷺ ہوتا ہے۔ لیکن اچھی نعت کے لیے ایک شرط قلب گداز کا ہونا بھی ہے۔ منظور ہاشمی صاحب ان شرطوں سے کماحقہٗ واقف ہیں، ان کی وضاحت اُن کے نعتیہ کلام میں دیکھیے:

بیانِ رُتبۂ عالی میں جب زباں کھولو
لبوں پہ سوزِ صداقت بہت ضروری ہے

اور

نبی کے دین کی راہوں پہ چلنے والوں کو
نگاہ و دل کی طہارت بہت ضروری ہے
یہ دین حق ہے خیالوں میں کوئی جھول نہ ہو
نفس نفس میں نفاست بہت ضروری ہے

منظور اعظمی صاحب کا ذہن عصری حِسّیت سے مملو ہے۔ پیرایہ بیان میں بھی اُن کا یہ ادراک بطونِ شعر میں دیکھا جاسکتا ہے انھوں نے نعت کا معاشرے سے رشتہ کس سلیقے سے جوڑا ہے۔ جب ہمارا رسول ﷺ ہر زمانے کا ہادیٔ برحق ہے۔ تو ہر زمانے کے دُکھ کا اظہار بھی اس وسیلے سے ہوسکتا ہے:

یہ دور کس مسیحا آمادۂ ستم ہے
ہے گام گام زنداں مقتل قدم قدم ہے

نعت کے علاوہ منظوم صورت میں منقبت کا وقیع اور لائقِ مطالعہ حصہ ہے۔ اس کو حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت معاویہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور "سلام بحضور امام عالی مقام" کے اذکارِ محترم

سے، آراستہ کیا گیا ہے۔ ان اذکار کی شمولیت سے سرودِ حرم۔ چیزے دیگر بن گئی ہے۔

"سرودِ حرم" کے تعارفی کلمات حسنین کاظمی، نکہت بریلوی، ڈاکٹر فدا حسین انصاری اور ذہرہ دونی نے لکھے، جن سے منظور اعظمی صاحب کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خود منظور اعظمی نے "کچھ اپنے بارے میں" کے توسط سے اپنا تعارف کرایا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی سرودِ حرم قابلِ مطالعہ کتاب ہے اور مدحتِ رسولؐ کے خزانۂ کتب میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

(ا۔س)

خشک و تر ملک و لوگ

علی حسن سمند طور

صفحات ۱۹۶، قیمت =/۱۶۰ روپے

مکتبہ دانیال۔ عبداللہ ہارون روڈ صدر۔ کراچی

جرمنی کے دو مشہور موسیقار باخ اور ہینڈل معاصر تھے۔ دونوں ہی عظیم۔ باخ تمام عمر اپنے وطن سے چالیس میل بھی ادھر اُدھر نہیں گیا تھا۔ لیکن ہینڈل سیاحت کے شوق میں جہانیاں جہاں گشت بنا۔ ان کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے، ناقدین موسیقی نے دونوں کی عظمت کو یکساں تسلیم کیا لیکن ہینڈل کے فن میں تنوع کی لہروں کا وفور دیکھا جو سیاحت کی عطا کردہ ہیں۔

سمند طور بھی ایسے ہی ایک سیاح ہیں جنھوں نے اس چھوٹی سی عمر میں کم و بیش ۳۵ ممالک کی سیر کرڈالی ہے۔ اس سیاحت نے مشاہدات و تجربات کے تنوعات کا ایک خزانہ سمند طور کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ ہر تجربے اور مشاہدے کا اظہار اپنے ساتھ تازہ الفاظ و بیان بھی لاتا ہے، لہٰذا سمند طور صاحب کی تحریر کئی اعتبار سے تازہ کاری کا نمونہ لگتی ہے۔ ان کی چوکس نگاہی نے ہر نظارے کی تہہ تک پہنچنے اور اشیا کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ایک بات اور سمند طور صاحب کے سفرنامے کو پڑھ کر ذہن میں جو بے ساختہ خیال اُبھرتا ہے وہ یہ کہ وہ بنیادی مزاج کہانی کار کا رکھتے ہیں۔ اُن کا یہ سفرنامہ کہانی کے عنصر سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں کہیں یہ عنصر بیان کا لبادہ پہن کر مبالغہ کی سرحد چھوتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ آپ اسے سفرنامہ نگار کے بیان کے حسن پر محمول کیجیے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں قاری کا واسطہ کہانی اندر کہانی سے بھی پڑتا ہے۔

شروع سے آخر تک سمند طور کا قلم بے ساختہ چلتا رہتا ہے۔ اس بے ساختگی کے عالم میں، دل کو چھولینے والے فقرے پڑھنے کو ملتے ہیں، فقرے کی تہہ داری قاری کو اپنے پاس کچھ لمحے رُکنے پر مجبور کردیتی ہے۔ ایسے فقرے جابجا دیکھنے میں آئے۔ مثال کے طور پر یہ فقرے ملاحظہ کیجیے:

"کمزور قومیں جب اپنی شناخت کے لیے کوئی مثبت فلسفہ وضع نہیں کرپاتیں تو دوسروں سے نفرت کو اپنی شناخت کا ذریعہ بناتی ہیں"۔

ایتھنز کے سفر کے بیان میں ایک فقرہ دیکھیے:

"واقعی خدا کے بعد ماں ہی ایسی مخلوق ہے جو ساری دنیا میں ماں ہی رہتی ہے"۔

سمند طور کا سفرنامہ "خشک و تر ملک و لوگ" بہت دلچسپ ہے۔ اس کے مطالعہ سے قارئین نہ صرف بیرونی ممالک کے نادیدہ مقامات کی سیر کا لطف اُٹھاتے ہیں، بلکہ وہاں کی تہذیب و ثقافت اور دیگر احوال سے بھی باخبر ہوتے ہیں۔

سمند طور نے سفر نامہ نگاری کا ایک بھرپور اسلوب پالیا ہے۔ یوں بھی ہر دور اور ہر نسل اپنے لیے زبان و بیان خود وضع کرتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ۔

کتاب دیدہ زیب شائع ہوئی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا۔ س)

جھاڑیاں اور جگنو

اکبر حمیدی

صفحات ۱۲۳، قیمت = ۷۵/ روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

اکبر حمیدی کی انشائیہ نگاری کی عمر سولہ برس ہونے کو آئی۔ یہ عمر شباب کی ہوتی ہے۔ انگریزی میں ہم اس عمر والے کو Teenager کہتے ہیں۔ اور اس کی رفتار بھی نسبتاً تیز ہی رہی ہے اس لیے کہ اس سولہ برس کے عرصے میں اُن کے تین انشائیوں کے مجموعے۔ "جزیرے کا سفر"، "تتلی کے تعاقب میں" اور "جھاڑیاں اور جگنو" شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ تینوں مجموعوں میں شامل انشائیوں کی تعداد ۶۶ بتائی جاتی ہے۔

"جامن کا پیڑ" جیسا انشائیہ وہی لکھ سکتا ہے۔ جس کے گھر میں جامن کا پیڑ رہا ہو اور جس نے ہر موسم میں اور ہر زاویے سے اس کے منظر کا مشاہدہ کیا ہو بلکہ اس نے اپنے دل میں جامن کا ایک پیڑ اگا لیا ہو۔ اور اپنے صحن سے اس پیڑ کی جُدائی کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو۔ پیڑ سے اس قُربت اور اپنائیت کو انشائیہ نگار نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اس کی جُدائی کا تصور ہی اس کے دل میں رقت بھر دیتا ہے۔ اپنائیت کا یہ جذبہ صرف انسان ہی کے لیے نہیں کسی بھی شے کے لیے دل میں ابھر سکتا ہے۔ دل لگی دیوار سے تو پری کیا کرے۔

"جگنو اور جھاڑیاں" ایک اور دامنِ دل کھینچنے والا انشائیہ ہے یہ انشائیہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا لکھاری متنوع لفظیات کا مالک ہے۔ ایک اچھے انشائیہ کی بنت میں لفظیات، محاورے اور برجستہ فقرے بڑے کار آمد ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ذہن رسا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کا دروازہ صاحبِ کتاب پر بند نہیں۔

"جھاڑیاں اور جگنو" کا آغاز اس طرح کے پُر معنی جملوں سے ہوتا ہے:

> "جھاڑیاں میرا ماضی ہے۔ جگنو مستقبل اور حال میں خود ہوں۔ جگنو کا تعلق بھی میرے ماضی سے تھا مگر وہ سارے زمانوں کی حدوں سے آگے نکل گیا۔ حتّٰی کہ مجھ سے بھی اور اب تو وہ مستقبل کی بھی آخری منڈیروں پر دمک رہا ہے"۔

جدید انشائے کی ترویج ساٹھ کی دہائی میں ہوئی۔ مواد کے اعتبار سے یہ اتنا پھیل بڑھ گیا کہ اسے باضابطہ ایک صنف کا درجہ حاصل ہو گیا۔ انشائیہ کو یہ مقام دلانے میں سرفہرست نام وزیر آغا کا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں نے نہیں لکھا۔ مشتاق قمر، ڈاکٹر انور سدید، مشکور حسین یاد، پروفیسر نظیر صدیقی، کامل القادری مرحوم، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی اور دوسرے احباب قابلِ ذکر ہیں جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہا ہے۔ وہ لائق ستائش ہیں۔

انشائیہ کے اس کاروان جدید میں ایک نمایاں نام اکبر حمیدی کا بھی ہے۔ میں نے کاروان جدید اس لیے کہا ہے کہ ہمارے ماضی پرست اصحابِ قلم کھینچ تان کر اس نوعمر کا رشتہ بھی ماضی میں ڈھونڈنے کی سعی فرماتے ہیں۔

اکبر حمیدی اپنے چہرے بشرے سے ایسے لگتے ہیں کہ بے چارے "نو جانتے ہیں مجھے جانتے ہی نہیں (یہ تاثر میں نے کتاب کی پشت پر کی تصویر سے لیا ہے)۔ دو بدو ملا ہوں تو بھی اُن کی سادگی سے میں نے یہی تاثر لیا ہے۔

جگنو اور جھاڑی کے مطالعہ کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک کا بچپن سامنے آجاتا ہے اور وہ خود جگنوؤں کے پیچھے جھاڑیاں پھلانگتا پھرتا ہے۔

سارے جہاں کی سادگی جیسے اکبر حمیدی کے پیکر میں جمع ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے انشائیے پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بلا کا شوخ و ظریف ہے لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتا ہے۔ لفظوں کے منہ میں زبان تو دیتا ہی ہے۔ کسی کسی کے ہاتھ میں سوئیاں بھی تھما دیتا ہے۔

کتاب سلیقے سے چھپی ہے۔ انشائیہ کے خزانے میں ایک نئے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ا۔س)

پوئٹری اوراق انتھولوجی

ڈاکٹر وزیر آغا

صفحات ۱۲۰، قیمت = ۱۰۰ روپے

مکتبہ اوراق۔ لاہور

انگریزی نظموں کے اُردو تراجم کا یک طرفہ ٹرافک تو ایک عرصے سے جاری ہے۔ کون سا اُردو کا ایسا قابلِ ذکر شاعر ہوگا جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے ایک آدھ غیر ملکی نظم کا ترجمہ نہ کر چکا ہو۔ پچھلے پچاس سالوں میں، والٹ وھٹ مین، لورکا، ناظم حکمت، پبلو نرودا، میر یار لکے، اوکتاویو پاز، ایرن کرسر، گریگوری کورسو، اور دیگر شعرا کی تخلیقات ترجمہ ہو کر اُردو کے اس اثاثے میں شامل ہو چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات نے تو دوسری زبانوں سے اُردو میں تراجم کے انبار لگا دیے ہیں۔ جن کی افادیت اور خدمت سے انکار ممکن نہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے پوئٹری اوراق انتھولوجی کے ذریعے (بہ قول اُن کے) افہام و تفہیم کے دو طرفہ ٹرافک کو پہلی بار رواج دیا ہے۔ یعنی انگریزی نظموں کو اُردو کے قالب میں ڈھال کر اور اُردو نظموں کو انگریزی میں منتقل کر کے ایک ساتھ شائع کرنے کا، کارِ مستحسن انجام پا رہا ہے۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے اُس جذبے کا مظاہرہ ہے کہ اُردو نظموں اور اُن کے خالقوں کو انگریزی اور امریکی ممالک سے متعارف کرایا جائے۔ تراجم کی اس دو طرفہ صورت سے عام قارئین اور اس سے متعلق شعرا، نظموں کے اُردو تراجم کے شانہ بشانہ انگریزی تراجم سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ یا محظوظ ہونے کی سبیل پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح "پوئٹری اوراق انتھولوجی" کے ذریعے یورپی شعرا اور ادبی حلقے سے پاکستان و ہندوستان کے شعرا اور پاک و ہند کے شعرا سے یورپی، امریکی، انگریزی و جاپانی اور دیگر زبانوں کے شعرا قریب تر آرہے ہیں۔ اس سلسلے کی افادیت یہ بھی ہے کہ اُردو ادب مقامیت سے نکل کر بین الاقوامیت اختیار کر رہا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے پوئٹری اوراق کے دیباچے genetic کے حوالے سے لکھا ہے کہ ماہر جنسیات ایسی دوائیں ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو موروثی امراض کی جڑ کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ اسی طور سماجی خرابیوں کا علاج بھی محض تدارک تک محدود نہیں

ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کے معالج کی رسائی بنیادی اسباب کے خاتمے تک ہونی چاہیے۔ جب تک مرض جڑ سے اکھیڑ کر پھینکا نہیں جاتا۔ معاشرہ کے جسم میں لگے کینسر سے نجات ممکن نہیں!

اداریے میں وزیر آغا نے دو طرح کے تراجم کی صراحت کی ہے ایک لفظ بہ لفظ اور دوسرا آزاد ترجمہ۔ دونوں طرح کے تراجم کے حق میں ادبی رائے عامہ موجود ہے لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمے میں مترجم اصل متن سے قریب تر رہتا ہے۔ لیکن آزاد ترجمے میں اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ مترجم کہیں اپنی بقراطی نہ اس میں داخل کردے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس بات کو کہ مترجم ترجمے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرے اس کے صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یوں بھی ایک ہی نظم کو جب دو شخص ترجمہ کرتا ہے تو کئی اعتبار سے دونوں ترجمے مختلف نظر آتے ہیں۔

بہر حال پوئٹری اوراق کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے کیونکہ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ہم اُردو اور انگریزی اور دیگر زبانوں کے کلام کو ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور دیگر زبانوں کی رفتار اور رجحان سے ہم باخبر ہوتے ہیں۔

(ا۔ س)

منتخب مختصر نظمیں

انتخاب و ترتیب: عامر ضمیر
صفحات ۲۳۲، قیمت = /۱۲۰ روپے
ماہم پبلی کیشنز ۲۹۳/۱۵۔ دستگیر سوسائٹی فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

یوں تو ہر تیسرا مبصر اپنی چوتھی زیرِ تبصرہ کتاب کے لیے "صوری و معنوی اعتبار سے خوبصورت" جیسا جملہ استعمال کرنے سے نہیں ہچکچاتا ہے۔ کثرت استعمال سے اس فقرے کی معنویت بھی معدوم سی ہو گئی ہے۔ لیکن کبھی کبھی کسی کتاب پر یہ فقرہ سو فی صد درست بیٹھتا ہے۔

ایسی ہی ایک کتاب عامر ضمیر کی "منتخب مختصر نظمیں" ہے جس پر "صوری و معنوی اعتبار سے خوبصورت" کا جملہ زیب دیتا ہے۔

کتاب میں ۱۸۸ شعرا کی تخلیقات شامل ہیں ان ناموں کی فہرست کے سیاق و سباق پر نظر دوڑائیے تو پاکستان اور بیرونی ممالک بالخصوص پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے اُردو شعرا شانہ بہ شانہ، نظر آتے ہیں۔ اس کتاب میں مقفّٰی و معرّا اور آزاد نظموں سے لے کر نثری نظموں تک کی نمائندگی ہوئی ہے۔ مذکورہ ممالک کے اکثر نمایاں نام جن کا خیال آپ کے دل میں آسکتا ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر موجود ملیں گے۔

اس لحاظ سے عامر ضمیر کی کتاب "منتخب مختصر نظمیں" ایک نمائندہ انتخاب کہا جائے گا۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے شعرا کے نمائندہ کلام اس میں شامل ہوں، نمائندہ ہونے کا معیار عامر ضمیر نے اپنی پسند کو بنایا ہے۔ کلام کے حصول میں کچھ شعرا کا کلام ان سے مل کر حاصل کیا ہے۔ اور کچھ کے کلام کے حصول کا ماخذ ملک و بیرون ملک کے جرائد و رسائل رہے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں تعارفی کلمات ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر یونس حسنی، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر جمیل اختر خاں، اور ڈاکٹر مشرف نے تحریر کیے ہیں۔ جن سے کلام کے انتخاب کی غرض و غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ سب کے سب ادب کے موقر نام ہیں۔

عامر ضمیر نے اپنے پیش لفظ کا آغاز ان اقوال سے آراستہ کیا ہے:

(۱) ہر نظم ایک خیال ہے اور ہر موضوع ایک احساس

(۲) ہر نظم خاموشی کی اولاد ہوتی ہے بعض دفعہ شاعر اپنی خاموشی سے گھبرا کر نظم لکھتا ہے تاہم بعض نظمیں خود خاموشی کی نذر ہو جاتی ہیں۔

(۳) ان نظموں کو میں نے شاعروں کی اُس کاوش سے سینچا ہے جو زندگی کے اندھیروں میں جگنو کی طرح اجالا کرتی ہے۔ یہ نظمیں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں رنگ منعکس کرتی ہیں....."

کتاب کا انتساب مادرِ علمی جامعہ کراچی کے نام ہے۔ اس کے صوری و معنوی حُسن کی داد پہلے ہی دی جا چکی ہے۔

(ا۔ س)

شعریاتِ شرق و غرب

مقصود حسنی

صفحات ۳۲۸، قیمت =/۲۵۰ روپے

ناشر: مہد پبلشرز معرفت مقصود حسنی، شیر ربانی ٹاؤن، کالج روڈ، قصور پاکستان

پروفیسر مقصود حسنی متحرک اور محنتی حرف کار (قلم کار) ہیں۔ خیر سے جواں سال ہیں۔ علم و ادب سے ان کی غیر معمولی لگن، شب و روز کی محنت اور مطالعہ کی بدولت ان کی دو درجن کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں ہائیکو نظم، غزل، ترجمہ، افسانہ، طنز و مزاح اور تحقیق و تنقید کی کتابیں شامل ہیں لیکن مقصود حسنی کا اصل میدان تحقیق و تنقید ہی ہے۔

شعریات شرق و غرب میں مقصود حسنی نے جہاں اُردو فارسی سندھی، پنجابی، براہوی زبان و ادب پر فاضلانہ بحث کی ہے وہاں روسی، انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، اطالوی، شاعری سے متعلق ناقدانہ رائے کا اظہار بڑی جرأت و بے باکی سے کیا ہے۔ مقصود حسنی نے مشرقی ادبیات کے ساتھ ساتھ مغربی افکار و نظریات سے بھی کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مشرقی و مغربی شعرا و ادبا نظم و نثر کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ کہ اس ترقی یافتہ دور میں سائنس، ٹکنالوجی، تحقیقات اور ایجادات مشرق و مغرب کے تہذیبی و ثقافتی بُعد کے باوجود آج کرۂ ارض کی وسعتیں ایک آنگن کی صورت میں سمٹ گئی ہیں۔ عالمی سطح پر محبت، انسان دوستی امن و سلامتی، فلاح و بہبود کی فضا قائم رکھنے کے لیے اہلِ قلم و اہلِ دانش خواہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ایک دوسرے کے درمیان ذہنی و فکری ہم آہنگی، دلی قربت اور افہام و تفہیم کی استواری و ہمواری کے لیے ادب ہی ایک پل کا فریضہ ادا کر سکتا ہے اور یہ کام شعریات و ادبیاتِ مغرب و مشرق کے ذریعے سے بطریقِ احسن انجام پا رہا ہے جس کی ایک زندہ مثال مقصود حسنی کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "شعریاتِ شرق و غرب" ہمارے سامنے موجود ہے۔ طلبہ و اساتذہ کے استفادے کی غرض سے اس کتاب کو علمی، تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں محفوظ ہونا چاہیے۔

(ڈاکٹر وفا راشدی)

گردوپیش

ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو انجمن میں مدعو

۲۹/ستمبر ۹۸ء کو انجمن ترقی اُردو نے اپنی روایت کے مطابق حیدر آباد دکن سے آئی ہوئی ممتاز اردو افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو کے اعزاز میں دن کے گیارہ بجے ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ صدارت انجمن کے صدر جناب آفتاب احمد نے فرمائی۔ جناب امراؤ طارق نائب معتمد انجمن نے تقریب کا آغاز کرتے ہوئے ممتاز شاعر و دانشور جناب حمید نسیم کی گزشتہ شب رحلت پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کی پھر انھوں نے کہا کہ ہماری آج کی مہمان محترمہ جیلانی بانو ہیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہم اُنھیں برسوں سے پڑھتے آرہے ہیں۔ لہٰذا صدر محفل، پروفیسر سحر انصاری اور سامعین براہ راست مہمان گرامی سے تبادلۂ خیال کریں۔

پروفیسر سحر انصاری نے چند جملوں میں رسمی اظہار خیال کے بعد جیلانی بانو پر اپنا مضمون پڑھ کر سُنایا جو اختصار میں جامعیت کے اظہار کا نمونہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون میں وہ سب باتیں کہہ دیں جو پھیلا کر ایک طول طویل مضمون کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ اُنھوں نے جیلانی بانو کے فن افسانہ پر ایک بڑے پتے کی بات کہی کہ اُن کے افسانے بڑی قوت سے لکھے جاتے ہیں اُن کے افسانے اور ناول کا موضوع تلنگانہ ہے اُنھوں نے حیدر آباد اور اس کی معاشرت کو نہ عزیز احمد کی آنکھ سے دیکھا ہے نہ واجدہ تبسم سے اظہار میں کوئی مطابقت نظر آتی ہے۔

مہمان خصوصی جیلانی بانو نے مدرجلسہ کے استفسار پر کہ آپ اپنے ادبی کارناموں کے بارے میں مختصراً حاضرین کی اطلاع کے لیے کچھ فرمائیں جیلانی بانو نے کہا میرے افسانوں کے کئی مجموعے آچکے ہیں وہ سب کی نظر میں ہیں میرے ناول "ایوانِ غزل" کی ہندوستان بھر میں بڑی پذیرائی ہوئی، سرکاری سطح پر اس ناول کو اٹھارہ زبانوں میں ترجمہ کروایا جارہا ہے انھوں نے کہا کہ دوردرشن پر جلد ہی اس ناول کو قسط وار پیش کیا جائے گا۔ میرا ایک اور ناول "بارشِ سنگ" پاکستان سے چھپا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری کے اس سوال پر کہ آپ آمنہ ابوالحسن اور واجدہ تبسم کے بعد حیدر آباد میں اس قدوقامت کے نئی نسل میں کچھ افسانہ نگار اُبھرے ہیں؟

جیلانی بانو نے جواباً کہا ہمارے ہاں اس عرصے میں نئے افسانہ نگار کم آئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اس کمی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں اُن میں ایک سبب یہ ہے کہ حیدر آباد اسٹیٹ کی زبان تلگو اور سرکاری زبان ہندی ہے، امورِ مملکت میں ہندی اور تلگو کا عمل دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اُردو کی رسائی کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ان سے قطع نظر ایک مثبت رُخ یہ بھی ہے کہ پورے ہندوستان میں اُردو رابطے کی زبان ہے۔ مشاعرے سُننے والوں میں سب سے زیادہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، اور فلم کی زبان بھی اُردو ہے۔

مختار اجمیری نے پوچھا: آپ کو ورثے میں شاعری ملی لیکن آپ نے افسانہ نگاری کو اپنایا؟

جیلانی بانو نے جواب میں کہا ہمارے گھر کا ماحول میرے والد علامہ حیرت بدایونی کی وجہ سے خاصا شاعرانہ تھا۔ میں نے اس گھر میں جگر، مانی جائسی، فانی بدایونی، یگانہ اور جوش کو دیکھا اور سُنا ہے۔ اس کے باوجود میں شاعری کی طرف نہیں گئی۔ اسے اُفتادِ طبع سمجھیے۔

شہاب قدوائی نے جیلانی بانو کو مخاطب کر کے کہا کہ ہندوستان کے اردو افسانوں میں علاقائی اثرات بہت دیکھے جا رہے ہیں؟

جیلانی بانو نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ علاقائی اثرات اُردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری زبان علاقائی تہذیب سے آشنا ہو رہی ہے۔

ذوالفقار مصطفےٰ نے کہا کہ ادب میں یہ لین دین پُرانا ہے بیدی، کرشن چندر، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کا دل دھڑکتا ہے۔

انیق احمد نے کہا کہ نئے افسانہ نگاروں کی آمد میں کمی صرف حیدر آباد دکن ہی کا مسئلہ نہیں کراچی میں بھی ہم اس مسئلے سے دوچار ہیں۔ اُنھوں نے کہا نعیم آروی کے بعد مشکل سے ایسے افسانہ نگار آئے جنھوں نے کراچی کے مسائل پر سنجیدگی سے قلم اُٹھایا۔ کراچی کے ہنگاموں پر البتہ ان کے معاصرین کی کتابیں شائع ہوئی ہیں جیلانی بانو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا اس موضوع پر امراؤ طارق صاحب اور آصف فرخی کے افسانے میری نگاہ سے گزرے ہیں۔

صبا اکرام نے کہا علاقائی پرابلم جیسے بلوچستان کے مسائل پر جمیل زبیری نے بھی قلم اُٹھایا ہے۔

کسی نے اُن کے مشہور ناول "ایوانِ غزل" کے مرکزی خیال کے بارے میں پوچھا تو جیلانی بانو نے کہا "نفرت کہاں کہاں ہے یہ نہیں دیکھنا ہے بلکہ محبت کہاں کہاں ہے یہ دیکھنا ہے۔ یہی اس ناول کا کلیدی نقطہ ہے۔

ان حضرات کے علاوہ گفتگو میں افتخار اجمل شاہین تقی حسین خسرو اور دوسروں نے بھی حصہ لیا تقریب کا اختتام مشروب پر ہوا۔

۲۹ تاریخ کو اگرچہ شہر میں ہڑتال کے اعلان کی وجہ سے مدعوئین میں اکثر لوگ نہ آسکے۔ پھر بھی اجتماع اچھا ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے شرکت فرمائی اُن میں صدرِ انجمن آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر حنیف فوق، جمیل زبیری و بیگم، تقی حسین خسرو، محمد سبتگین، انیق احمد، انیس صدیقی و بیگم زہت صدیقی، سلطان جمیل نسیم پروفیسر سحر انصاری، صبا اکرام، ذوالفقار مصطفےٰ، افتخار اجمل شاہین، اقبال انصاری فوزیہ روحی، مشعل حسن، زہت خورشید قابلِ ذکر ہیں۔

جناب احمد ندیم قاسمی کے لیے وزیرِ اعظم کا "کمالِ فن ایوارڈ"

ممتاز شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کے لیے وزیرِ اعظم کا "کمالِ فن" ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے، جو کسی دانشور کی زندگی بھر کی خدمات کے اعتراف کا پہلا انعام ہے۔ جس کی رقم پانچ لاکھ روپے ہے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اکادمی ادبیات پاکستان کے چیرمین نذیر ناجی نے بتایا کہ اکادمی ہر سال "وزیرِ اعظم ادبی انعام" تقسیم کیا کرے گی۔ جس کی رقم وزیرِ اعظم نے فراہم کی ہے۔ اس سال مندرجہ ادبی کتابوں کو انعام دیا گیا ہے۔

ایک لاکھ فی کس کا وزیرِ اعظم ادبی انعام مستنصر حسین تارڑ (ناول "راکھ") اشرف شاد (ناول "بے وطن") منصورہ احمد شاعری

"طلوع") سعود عثمانی (شاعری "قوس") پچاس ہزار فی کس کے انعامات ڈاکٹر آفتاب احمد (شخصی خاکے "بیادِ صحبت نازک خیالاں") الطاف گوہر ("لکھتے رہے جنوں کی حکایت") ڈاکٹر تحسین فراقی ("اقبال۔ چند نئے مباحث") ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ("آزادی کے بعد اردو ناول") آصف فرخی (ترجمہ: "موت اور قطب نما") اور توفیق رفعت (انگریزی: "اے سلیکشن") کو دیے گئے تقسیم انعامات کا فیصلہ احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، مشتاق یوسفی، شوکت صدیقی اور مشفق خواجہ پر مشتمل منصفین کی کمیٹی نے کیا۔

انعامات حاصل کرنے والی کتب کی مزید تفاصیل:

"راکھ" (ناول) مستنصر حسین تارڑ
یہ کتاب سنگ میل پبلشرز لاہور نے شائع کی ہے۔
صفحات ۵۸۸ قیمت =/۳۵۰ روپے

"بے وطن" (ناول) اشرف شاد
یہ کتاب ساؤتھ ایشین میڈیا اینڈ آرٹس ۱۶ویں۔ منزل کاشف سینٹر شاہراہ فیصل، کراچی نے شائع کی ہے۔
صفحات ۷۷۳ قیمت =/۳۰۰ بیرون ممالک ۲۰ ڈالر

"طلوع" (شاعری) منصورہ احمد
یہ کتاب اساطیر، ۴۵-اے مزنگ روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔
صفحات ۲۳۰ قیمت =/۱۶۰ روپے

"قوس" (شاعری) سعود عثمانی
یہ کتاب نما پبلشرز، بک سیلرز۔ ۱۴۔ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔
صفحات ۱۶۸ قیمت =/۱۲۰

"آزادی کے بعد اُردو ناول" (مقالہ) ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
یہ کتاب انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی۔ ۱۵۹۔ بلاک ۷ گلشن اقبال۔ کراچی نے شائع کی ہے۔
صفحات ۲۸۸ قیمت =/۱۵۰ روپے

"اقبال۔ چند نئے مباحث" (اقبالیات) ڈاکٹر تحسین فراقی
یہ کتاب اقبال۔ اکادمی پاکستان لاہور نے شائع کی۔
صفحات ۲۰۸ قیمت =/۱۰۰ روپے

"لکھتے رہے جنوں کی حکایت" (کالم) الطاف گوہر
یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے چھاپی
صفحات ۴۸۶ قیمت =/۳۰۰ روپے

"بیادِ صحبت نازک خیالات" (شخصی خاکے) ڈاکٹر آفتاب احمد
یہ کتاب مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی نے شائع کی۔
صفحات ۳۸۸ قیمت =/۳۰۰ روپے

"موت اور قطب نما" (لاطینی امریکہ کی کہانیوں کے ترجمے) آصف فرخی
یہ کتاب مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی نے شائع کی۔
صفحات ۲۹۲ قیمت =/۱۷۵ روپے

غالب انسٹیٹیوٹ کے انعامات

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی غالب انعامات سب کمیٹی نے اُردو کے دس اہم مقتدر اہلِ قلم غالب انعامات برائے ۹۶ء اور ۱۹۹۸ء - ۱۹۹۷ء منتخب کیے گئے ہیں جن کے اسمائے گرامی اور انعامات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۹۹۷ء - ۱۹۹۶ء:

(۱) فخرالدین علی احمد انعام برائے تنقید و تحقیق ڈاکٹر خلیق انجم
(۲) غالب انعام برائے اُردو نثر پروفیسر شکیل الرحمن
(۳) غالب انعام برائے اُردو شاعری جناب وامق جونپوری
(۴) ہم سب غالب انعام برائے اُردو ڈرامہ پروفیسر زاہد زیدی
(۵) مجلس غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

۱۹۹۸ء - ۱۹۹۷ء:

(۱) فخرالدین غالب انعام برائے تنقید و تحقیق پروفیسر مظفر حنفی
(۲) غالب انعام برائے اُردو نثر پروفیسر محمود الٰہی
(۳) غالب انعام برائے اُردو شاعری جناب مظہر امام
(۴) ہم سب غالب انعام برائے اُردو ڈرامہ جناب اے آر کاروار
(۵) مجلس غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات ڈاکٹر شام لال کالر (عابد پشاوری)

یہ انعامات ۲۵ ہزار روپے نقد ایک تمغہ اور سند پر مشتمل ہے یہ تمام انعامات بین الاقوامی غالب سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں ۱۱ دسمبر کو تقسیم کیے جائیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر پی ایچ ڈی

بھاگلپور یونی ورسٹی بہار نے محمد بشیر احمد کو "لائٹ ایے رائٹنگز آف وزیر آغا" کے موضوع پر مقالہ لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے اُردو انشائیہ نویس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی خدمات وسیع تر ہیں۔ انھوں نے انشائیہ کو ایک انفرادی انداز بخشا ہے، یہ انداز جس کا آغاز تقریباً ساٹھ کی دہائی میں ہوا یا اس سے ذرا پہلے آغا صاحب سے مختص ہے۔

("پارسا" بورے والا ۱۸ اکتوبر ۹۸ء)

اقبال آفاقی کے تنقیدی مجموعے معنی کے پھیلے آفاق کی تقریب پذیرائی

حلقہ اربابِ ذوقِ اسلام آباد میں ملک کے معروف نقاد اور دانشور پروفیسر اقبال آفاقی کے تنقیدی مجموعے "معنی کے پھیلے آفاق" کی تقریبِ پذیرائی منعقد ہوئی تقریب کی صدارت ممتاز شاعر جناب ضیا جالندھری نے کی۔ مہمانِ خصوصی معتبر نقاد جناب فتح محمد ملک تھے۔ جناب منشا یاد، ڈاکٹر رضیہ سلطانہ، پروفیسر زاہد نوید، جناب رشید نثار، جناب محمد حمید شاہد، ارشد جمال اور جناب امجد طفیل نے مقالات پڑھے۔ نظامت کے فرائض حلقے کے سکریٹری اصغر عابدی اور جانیٹ سکریٹری خلیق الرحمن نے انجام دیے حاضرین کی ایک بڑی تعداد نے تقریب میں شرکت کی۔

("پارسا"، ۱۸ اکتوبر ۹۸ء)

اعلیٰ علمی کارکردگی پر صدارتی ایوارڈ

صدرِ مملکت محمد رفیق تارڑ نے تعلیمی شعبے میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے مختلف افراد کو صدارتی اعزاز عطا کیے ہیں۔ سوشل سائنسز میں سال ۱۹۹۸ء کا اعزازِ فضیلت، گورنمنٹ کالج، لاہور میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمن کو دیا گیا ہے۔ اعزازِ فضیلت، میڈل، نقد رقم، سفر میں سہولت اور وظیفے پر مشتمل ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنقیدی نشست

ہر عہد کا مروجہ ڈکشن اور مروجہ موضوعات ہوتے ہیں۔ جو شاعر اس کو توڑ کر نکل جاتا ہے اس کی شاعری بڑی ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنقیدی نشست میں اختر سعیدی کی غزل پر صدارتی رائے دیتے ہوے ن۔م دانش نے کیا۔

تنقیدی نشست میں اختر سعیدی کی غزل پر تاج بلوچ، حسن وقار گل، صادق مدہوش، کاوش عباسی، نعمانہ شیخ، شبانہ رفعت، کاشف رضا نے اظہارِ خیال کیا، مجموعی اعتبار سے اختر سعیدی کی غزل کو روایت سے جڑا ہوا، کیفیت سے مملو کیا گیا اس میں چابکدستی محسوس کی گئی اور اسے ایک کامیاب غزل قرار دیا گیا۔ البتہ کاوش عباسی کے اس اعتراض کو کہ چراغ، دیے، ہوا اور آئینہ کے کثرت استعمال نے ان کا وقار دھیما کر دیا ہے ایک حد تک قابل توجہ سمجھا گیا نعمانہ شیخ نے تنقید کے لیے اپنا افسانہ "مباح" پیش کیا جس پر پہلا اعتراض یہ تھا کہ یہ افسانہ کم اور رپورتاژ زیادہ ہے۔ بلکہ مولڈنگ فارم میں افسانے کو برتا گیا ہے، افسانے پر رائے میں یہ بھی کہا

گیا کہ یہ بہت نازک موضوع تھا جسے بڑی جرات کے ساتھ اُٹھایا گیا ہے، موضوع کے لحاظ سے افسانہ بہت مضبوط ہے جبکہ افسانہ فنی لحاظ سے اپنا اعتبار قائم رکھنے میں ناکام رہا، افسانے پر یہ رائے بھی سامنے آئی کہ یہ افسانہ ڈائجسٹ کی کہانی کا اسٹائل لیے ہوئے ہے، مذہب کی آڑ میں تحفظ کے احساس کو اس افسانہ کا ایک نکتہ بنایا گیا ہے جو کہ معاشرتی پسماندگی کی طرف واضح اشارہ فراہم کرتا ہے۔ اور اگر مرد مذہب کو استعمال کر سکتا ہے تو عورت بھی یہ حق استعمال کر سکتی ہے، افسانہ عورت کی اقتصادی محکومی کی طرف واضح اشارہ لیے ہوئے ہے جو کہ افسانہ کا ایک فکر انگیز پہلو ہے افسانے پر تاج بلوچ، شبانہ رفعت، کاشف رضا، کشور سہیل، وارث رضا، آصف مالک، کاوش عباسی، عدیل احمد، حسن وقار گل، صادق مدہوش، عرفان عابدی، عباس جارچوی، حسن عابدی اور ن۔م دانش نے گفتگو کی۔

(رپورٹ: وارث رضا)

حرفِ آگہی کی تقریبِ پذیرائی

۲۷ اکتوبر کو پاکستان گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والی کتاب "حرفِ آگہی" کی تقریبِ پذیرائی لے ڈی اے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا اہتمام حسن پبلی کیشنز اور پاکستان رائٹرز ویلفیئر فاؤنڈیشن کراچی کے اشتراک سے عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر حنیف فوق نے فرمائی، مہمانِ خصوصی جناب ابوبکر شیخانی تھے۔ مسند صدارت پر صدر تقریب اور مہمانِ خصوصی کے علاوہ جناب مسعود ارمان، جناب جاذب قریشی جناب علی حیدر ملک، اور جناب اظہر قادری تشریف رکھتے تھے۔ نظامت کے فرائض جناب جاوید منظر نے انجام دیے۔

تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جناب علی حیدر ملک نے حرفِ آگہی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب تصنیف نہیں تالیف ہے، اس میں بائیس مضامین مختلف صاحبانِ قلم کے شامل ہیں جن میں چار مضامین خود مسعود ارمان صاحب کے تحریر کردہ ہیں۔ بنیادی بات ہے کہ مسعود ارمان کتاب کے آدمی ہیں، کتاب پڑھنا اور پڑھوانا ان کا ذوق بھی ہے اور پیشہ بھی۔

جناب علی حیدر کے اظہارِ خیال کے بعد جناب مسعود ارمان نے صاحبِ صدر اور مہمانِ خصوصی کو حرفِ آگہی کا ایک ایک نسخہ پیش کیا۔ جمیل اختر اشرفی نے جناب مبارک مونگیری کی نعت پڑھی۔

جناب جاذب قریشی نے کہا کہ ہمارے عہد کو شاعری سے زیادہ نثر نگاری کی ضرورت ہے۔ صاحبِ کتاب نے بہت سے مضامین کو یکجا کر کے قارئین کے لیے ایک نگار خانہ سجایا ہے۔

پروفیسر اظہر قادری نے کہا کہ آج کل کتب بینی کی عادت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اِن حالات میں ادبی کتاب کی اشاعت جرات رندانہ سے کم نہیں۔

صاحب کتاب جناب مسعود ارمان نے اپنے اظہاریہ میں جناب حکیم محمد سعید ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر سحر انصاری کے خطوط کا ذکر کیا جو اُن کے نام حرف آگہی کی پذیرائی میں لکھے گئے۔

مہمانِ خصوصی جناب ابوبکر شیخانی نے کہا کہ میری نظر میں اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ مرحوم حکیم محمد سعید صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ اس کتاب کی تقریبِ پذیرائی میں حصہ لینا ہے۔

اُنھوں نے کہا میرے جیسا شخص جو کتابی آدمی نہیں ہے لیکن اس کتاب کو پڑھ کے اس نتیجے پر پہنچا کہ کچھ کتابیں ضرور پڑھنی چاہیے۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر حنیف فوق نے کتاب کے حوالے سے سابق مشرقی پاکستان سے اس کے تہذیبی تعلق کو یاد کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ قیامِ پاکستان کے بعد وہاں مسلم زبان لکھنے کا رجحان چل پڑا تھا۔ انھوں نے ڈھاکے میں ۱۹۰۶ء میں ہونے والے مسلم لیگ کے جلسے کا ذکر کیا۔ انھوں نے تقسیمِ بنگال کو پاکستان کی جانب پہلا قدم کہا۔ اور شوکت صدیقی اور شوکت عثمان کے ادبی رشتے کو یاد کیا۔

تقریبِ پذیرائی کا اختتام چائے پر ختم ہوا۔

ایک شمع اور بجھ گئی

محترم جناب عطاءاللہ صاحب مفکرِ قرآن اور شیدائی طلوعِ اسلام بچاسی سال اور ڈھائی ماہ کی عمر میں بہار کے ضلع جہاں آباد قصبہ علی نگر پالی میں مورخہ ۱۱ اگست کو دس بجے دن وفات پا گئے۔

جناب پالوی صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں خاص طور پر مال بصیرت، انوارِ تفکر، حلال و حرام اور شمع ضروزالی قابلِ ذکر ہیں، مرحوم ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۳ء تک چھپیرہ میں رہ کر فکرِ قرآن کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف رہے۔

مرحوم قیامِ پاکستان سے پہلے نگار کے لیے مستقل لکھا کرتے تھے ان کی پہلی تصنیف انگبیں کافی مشہور تھی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۹۸ء)

"اتنے اچھے موسم میں" کی تقریب پذیرائی

سعودی عرب میں مقیم معروف شاعر اور ادیب نسیم سحر کے آٹھویں شعری مجموعے "اتنے اچھے موسم میں" کی تقریب پذیرائی گزشتہ دنوں معروف شاعر سید ظفر مہدی کی میزبانی میں ادبی تنظیم دائرہ ادب کے زیر اہتمام ایک مقامی ریسٹورنٹ کے وسیع آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔

تقریب کا آغاز قاری غلام مجدد کی تلاوتِ قرآنِ حکیم سے ہوا۔ جدہ کے نوجوان ثناء خوان حبیب اللہ بھٹی نے نسیم سحر کی نعت مخصوص انداز میں سنا کر سماں باندھ دیا۔ تقریب کی صدارت پاکستان کمیونٹی کے معزز رہنما اور حلقہ یارانِ وطن کے بنیادی رُکن شہباز حسین چوہدری نے کی۔ سٹیج پر صدر تقریب کے علاوہ جناب شبنم مناروی، صحابِ شام نسیم سحر، ڈاکٹر پرویز احمد اور بزرگ شخصیت انجینئر اقبال احمد ہمدانی جلوہ افروز تھے۔ سٹیج پر آ کر صاحبِ شام کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا شبنم مناروی نے "اتنے اچھے موسم میں" کی رونمائی۔

ایک خوبصورت مضمون نسیم سحر اپنے گھر میں کے عنوان سے صاحب شام کی رفیقۂ حیات نے پیش کیا۔ جو ادبی انداز میں نسیم سحر کی شخصیت، ادبی رجحانات اور گھرداری کے معاملات کے تمام پہلوؤں کی عکاسی پیش کرتا تھا۔

اس موقع پر جناب نسیم سحر کے احباب و قدرداں، انجینئر کمال عالم خاں، فیاض عالم یوسفی، اطہر عباسی، نورین طلعت، پروفیسر واصل عثمانی، مرزا یوسف رہبر، اعتماد صدیقی، ڈاکٹر حسین احمد پراچہ، شبنم مناروی، نعیم بازید پوری اور عذرا نقوی نے جناب نسیم سحر پر منظوم و منثور اظہارِ خیال کیا اور اُن کے تازہ شعری مجموعہ "اتنے اچھے موسم میں" کی اشاعت پر انھیں مبارک باد پیش کی۔

جناب شہباز حسین چوہدری نے اپنے صدارتی خطاب میں صاحبِ شام اور دائرہ ادب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج اس تقریب میں شرکت کر کے یہ محسوس ہوا ہے ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جو دوستوں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور حقداروں کی پذیرائی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے نسیم سحر کی شاعری پر برملی دانشمندانہ گفتگو کی۔

یہ تقریب رات دو بجے تک جاری رہ کر اختتام کو پہنچی۔ تقریب کے حسنِ انتظام میں سردار شیر بہادر خاں، ملک سرفراز احمد، چوہدری تصور حسین اور عبدالباری نے حصہ لیا۔ آخر میں تقریب کے سرگروہ سید ظفر مہدی نے مہمانانِ خصوصی اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ تقریب ادبی حوالے سے مدتوں یاد رہے گی۔

آخر میں صاحبِ شام نسیم سحر نے کلام سُنایا۔

(رپورٹ: نور محمد جرال)

ڈھاکے میں نوشاد نوری کے ساتھ ایک شام

بنگلہ دیش کے مشہور اردو شاعر جناب نوشاد نوری کے اعزاز میں ڈھاکے میں اُن کی پچھترویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر ایک ادبی نشست ترتیب دی گئی جس میں کثیر تعداد میں اُردو اور بنگالی ادبا و شعرا نے شرکت کی اور جناب نوشاد نوری کی گراں قدر ادبی خدمات پر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

نوشاد نوری گزشتہ دنوں علاج کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہوئے تھے وہاں بھی اُن کی پذیرائی میں تقریبات منعقد کی گئیں۔

(۲۵ اکتوبر "جنگ" کراچی)

مولانا احسن مارہروی

آثار و افکار

از

ڈاکٹر صابر حسین خان جلیسری

صفحات: ۴۲۴ قیمت =/۶۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270 Phone: 461406

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

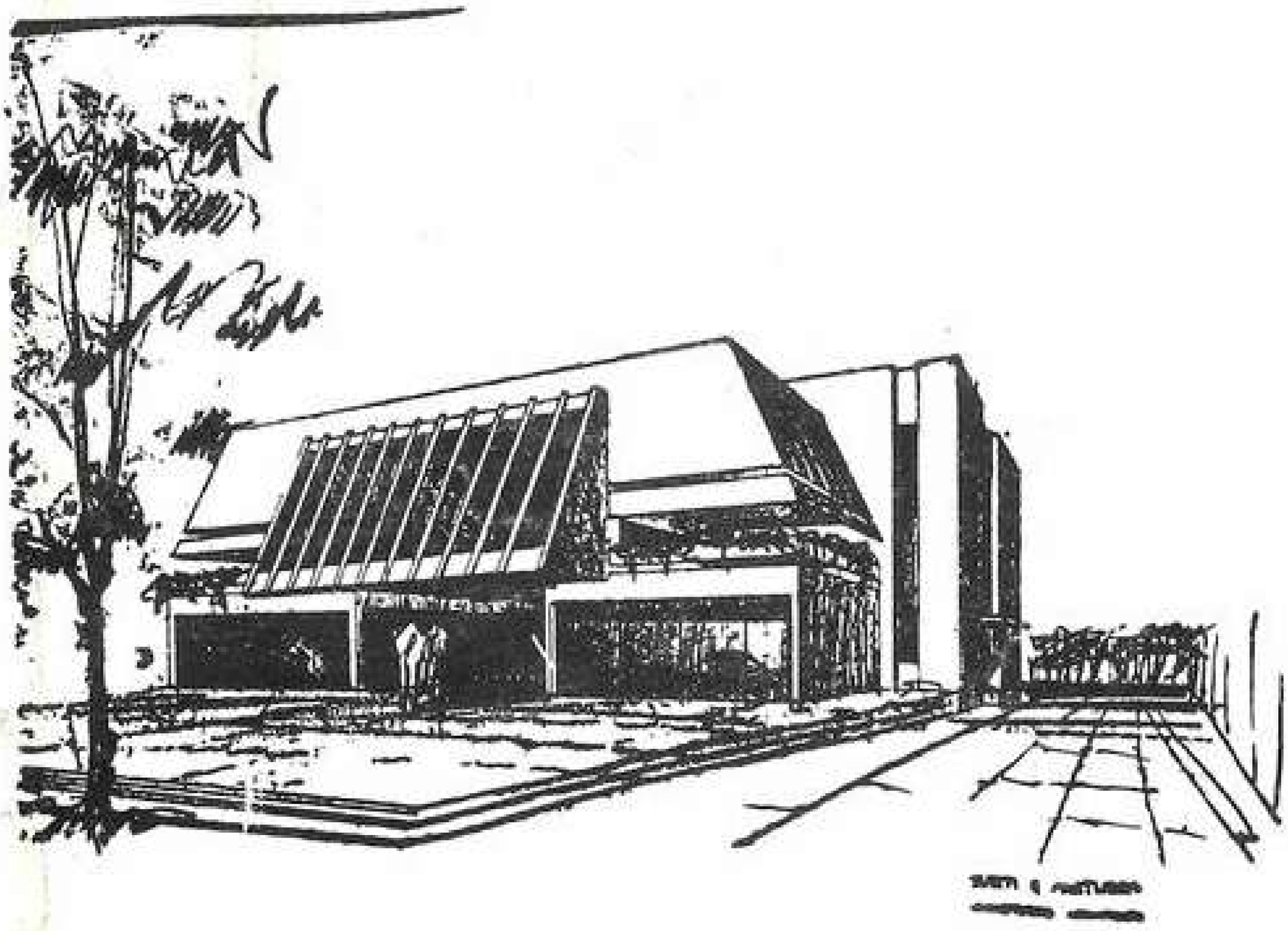

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لیمٹڈ کراچی مقام اشاعت ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی